قرآن وحدیث کے متعلق اردو زبان کا پہلا سہ ماہی مجلہ محکمہ

کتاب و سنت

حجلد-02 | جنوری-مارچ 2026 | شمارہ-01

گزارش

محترم قارئین!

سہ ماہی کتاب وسنت مطالعاتِ قرآن وحدیث کے میدان میں ایک بالکل منفرد کوشش ہے۔ الحمدللہ یہ مجلّہ ایک سال سے جاری ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمیں آپ کی حوصلہ افزائی حاصل ہے۔ اس رسالے سے ہمارے پیش نظر بڑے مقاصد ہیں، جن پر ہم کتاب وسنت کے اداریوں میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہ کوئی عارضی منصوبہ نہیں، ایک طویل مدتی اور تادیر باقی رہنے والا منصوبہ ہے۔

اس رسالے کے تمام مصارف (سالانہ ایک لاکھ روپے) رسالے کی بزم ادارت کے ذاتی تعاون سے پورے ہوتے ہیں۔ ان مصارف کو پورا کرنے کے لیے سبسکرپشن وغیرہ کا نظام بھی نہیں رکھا گیا ہے، تاکہ افادہ عام ہو اور رسالہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچتا رہے۔ گزارش ہے کہ آپ اس عظیم اور مبارک مشن میں ہمارا تعاون فرمائیں۔ یہ تعاون ان شکلوں میں ہوسکتا ہے:

- سہ ماہی کتاب وسنت کے لیے خصوصی تعاون کے طور پر رقم فراہم کرکے۔
- اپنے ادارے/کاروبار کا اشتہار دے کر۔
- اہل خیر احباب کو رسالے کی طرف متوجہ کرکے۔

امید ہے کہ ہمیں آپ کا تعاون حاصل رہے گا۔

والسلام

ادارہ سہ ماہی کتاب سنت

قرآن وحدیث کے متعلق اردو زبان کا پہلا سہ ماہی مجلہ محکمہ

کتاب و سنت

حجلد-02 | جنوری-مارچ 2026 | شمارہ-01

مدیر

شاہ اجمل فاروق ندوی

معاونین

عبداللہ شیرازی، محمد عمران

خط و کتابت کا پتہ

KITABOSUNNAT QUARTERLY

G-5/A, Abul Fazl Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Email: info@kitabosunnat.in
+91-9873298015 I +91-9654058854

غزل

فارسی کلام: امیر خسرو دہلوی

خبرم رسیدہ امشب کہ نگار خواہی آمد　　سر من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد

خبر ملی ہے کہ آج کی رات محبوب آئے گا، میری جان اس راہ میں قربان جس راہ سے وہ سوار آئے گا۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف　　بہ امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

صحرا کے سارے ہرن اپنا سر ہتھیلی پر لے کر منتظر ہیں، اس امید میں کہ ایک دن وہ محبوب شکار کو آئے گا۔

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بہ دیں ساں　　بہ جنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی آمد

عشق کی کشش تم کو ایسے ہی نہیں چھوڑ دے گی، اے محبوب! اگر تم جنازۂ عاشق پر نہیں آئے تو اس کی قبر پر ضرور آؤ گے۔

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم　　پس از آں کہ من نمانم بہ چہ کار خواہی آمد

میری جان لبوں پر ہے تم آجاؤ تاکہ میں زندہ ہو جاؤں، جب میں ہی نہ رہوں گا تو اس کے بعد تمھارا آنا کس کام کا۔

بہ یک آمدن ربودی دل و دین و صبر خسروؔ　　چہ شود اگر بہ دیں ساں دو سہ بار خواہی آمد

تمھاری ایک ہی آمد نے خسرو کے دل و جان اچک لیے، اب اگر اسی طرح دو تین بار اور آجائے تو کیا ہوگا؟

فہرست

اداریہ

معارفِ مصلح الامت کا علمی، عرفانی اور اصلاحی منصوبہ — شاہ اجمل فاروق ندوی — 07

قرآن اور صاحب قرآن — 11-502

کلام الٰہی ایمانی زندگی کا رہ نمائے کامل — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — 13

اِبلاغِ عامّہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں — ڈاکٹر احسان الحق — 23

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فہمِ قرآن کے اصول — پروفیسر احسان اللہ فہد فلاحی — 27

شاہ عبدالعزیز دہلوی کی ایک اہم تصنیف تفسیر عزیزی: ایک مطالعہ — ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی — 35

سنت اور صاحب سنت — 51-86

امام ابن جوزی کی سیرت نگاری — عبدالقدوس-ڈاکٹر محمد شہباز — 53

عظیم محدث علامہ شیخ محمد سعید حسرت عظیم آبادی — مفتی محمد خالد حسین نیموی قاسمی — 75

متفرقات — 87-98

دوزی کی تکملۃ المعاجم العربیۃ — مولانا عبدالمتین منیری — 89

معارفِ مصلح الامت کا علمی، عرفانی اور اصلاحی منصوبہ

قرآن وحدیث کا بے آمیز اور صاف ستھرا ذوق امت کی بنیادی ضرورت ہے۔اس ذوق کے سلسلے میں ابتدا ہی سے مختلف نوعیتوں کی کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں۔ یہ علمی ذخیرہ اب پوری لائبریری کی شکل اختیار کر چکا ہے۔اس ذیل میں کی جانے والی تمام کوششیں بہت مبارک ومسعود ہیں۔اس کے باوجود ہمیں اس بات کی شدید ضرورت رہی ہے کہ قرآن وحدیث کے حقیقی ذوق کو عوام میں اتارنے کی مؤثر کوشش کی جاتی رہے۔اس بڑی ضرورت کی تکمیل کے لیے ہر دور کے ایسے علما مفید ثابت ہوئے ہیں جن کا عوام سے گہرا تعلق رہا اور وہ اپنی سادہ زبان میں قرآن وحدیث کی بے آمیز تعلیمات کو لوگوں کے دلوں میں اتارتے رہے۔ ہندستان کے ایسے ہی علما میں ایک بڑا نام مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری الہ آبادی کا بھی رہا ہے۔

شیخ طریقت مولانا شاہ محمد قمر الزمان الہ آبادی کی نگرانی میں کئی برسوں سے مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری الہ آبادی کے

> وہ قرآنی آیات، احادیث نبویہ اور اقوالِ سلف کی روشنی میں لوگوں کو روحانی امراض سے دور رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ معاشرے کے بگاڑ کو کھول کھول کر بیان کرتے تھے۔عوام کو تنبیہ کرتے تھے اور علماء کو جھنجھوڑتے تھے۔اندرونی تڑپ کے نتیجے میں بسا اوقات یہ جھنجھوڑنا لفظی نہیں رہ جاتا تھا، حقیقی اور جسمانی بھی بن جاتا تھا۔ وہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کو پکڑ کر ہلانے لگتے تھے۔ جیسے وہ دنیوی بربادی اور اخروی تباہی کو کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہوں اور لوگوں کے دامن پکڑ پکڑ کر آگ میں گرنے سے روک رہے ہوں۔

علوم ومعارف کی ترتیب وتدوین اور اشاعت کا منصوبہ (Project) چل رہا ہے۔اس منصوبے پر کام کرنے کے لیے الہ آباد میں ادارہ معارف مصلح الأمت قائم کیا گیا۔اس ادارے کے تحت مختلف اہل علم اور ماہرین کام کرتے رہے۔ مصلح الامت کی متعدد قیمتی کتابیں، مضامین، مواعظ اور مجالس منظر عام پر آئیں۔ کچھ دنوں پہلے الہ آباد حاضری کے موقعے پر ادارہ معارف مصلح الامت کے منتظم مولانا عبداللہ قمر الزماں قاسمی الہ آبادی نے "معارفِ مصلح الامت" کی چھٹی جلد عطا کرتے ہوئے یہ مسرت آمیز خبر بھی سنائی کہ معارف مصلح الامت کی ساتویں اور آخری جلد بھی پریس میں ہے۔ان شاء اللہ جلد منظر عام پر آجائے گی۔

یہاں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی کی تمام علمی وعرفانی چیزیں ان سات جلدوں میں سما گئی ہیں۔ یہ سات جلدیں صرف اُن کے مجلسی ارشادات کا مجموعہ ہیں۔رسائل کا مستقل مجموعہ "تالیفاتِ مصلح الامت" پانچ ضخیم جلدوں میں

پہلے شائع ہو چکا ہے۔ کچھ کتابیں الگ سے بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق مصلح الامت کے تحریری اور تقریری کاموں پر مشتمل تقریباً دس ہزار صفحات ادارہ معارف مصلح الامت اور مکتبہ دارالمعارف، الہ آباد سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح علمی و عرفانی کاموں کی حفاظت کے معاملے میں بھی مصلح الامت کو اپنے مرشد و مربی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے بہت مشابہت و مماثلت حاصل ہوگئی ہے۔

اردو زبان میں مشاہیر کی مجلسوں کو محفوظ کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ معرفت کی دنیا میں وجود پذیر ہونے والا ملفوظاتی ادب بھی مجلسی ادب کا نہایت اہم اور بھرپور حصہ ہے۔ مجلسیں مختلف نوعیتوں کی ہوتی ہیں۔ کہیں سوالوں کے جوابات ہوتے ہیں، کہیں بہت اجمالی باتیں اور کہیں تفصیلی گفتگو۔ آخر الذکر نوعیت ہی مصلح الامت کی مجالس پر حاوی رہتی تھی۔ اُن کی مجالس سے استفادے کا





شرف حاصل کرنے والا شاید ہر شخص یہ بات بیان کرتا ہے کہ مجلسوں میں مصلح الامت پر عجیب بے قراری کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ قرآنی آیات، احادیث نبویہ اور اقوالِ سلف کی روشنی میں لوگوں کو روحانی امراض سے دور رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ معاشرے کے بگاڑ کو کھول کھول کر بیان کرتے تھے۔ عوام کو تنبیہ کرتے تھے اور علماء کو جھنجھوڑتے تھے۔ اندرونی تڑپ کے نتیجے میں بسا اوقات یہ جھنجھوڑنا لفظی نہیں رہ جاتا تھا، حقیقی اور جسمانی بھی بن جاتا تھا۔ وہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کو پکڑ کر ہلانے لگتے تھے۔ جیسے وہ دنیوی بربادی اور اخروی تباہی کو کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہوں اور لوگوں کے دامن پکڑ پکڑ کر آگ میں گرنے سے روک رہے ہوں۔ اُن کا علم نہایت مستحضر اور شوقِ مطالعہ حرص کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اپنے رسائل، مضامین اور مواعظ میں آیات ربانی، ارشادات نبوی اور اقوال سلف کا انبار لگاتے چلے جاتے تھے۔ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ لوگ کسی طرح بات سمجھ جائیں۔ کسی بھی صورت بے دار ہو جائیں۔ خود کو اور پورے معاشرے کو برباد ہونے سے بچالیں۔ اسی لیے ہم زیرِ نظر کتاب "معارف مصلح الامت" کو اصلاح و ارشاد کی عام کتاب نہیں کہہ سکتے۔

اس وقت ہمارے سامنے معارف مصلح الامت کی جلد ششم ہے۔ یہ جلد 616 صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں فہرست کے بعد ایک صفحے کا عرض ناشر مولانا عبداللہ قمر الزمان قاسمی نے لکھا ہے اور تین صفحے کا جامع مقدمہ شیخ طریقت مولانا شاہ محمد قمر الزمان الہ

آبادی کے قلم سے ہے۔اصل کتاب صفحہ نمبر 10 سے شروع ہوتی ہے۔کتاب میں مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی کی 36 مجالس کے ارشادات ہیں۔تمام مجالس کا ایک مرکزی موضوع طے کر کے اسے عنوان بنایا گیا ہے۔نہ جانے کیوں مجلس نمبر 12 اور 15 کو صرف مجلس کا عنوان دیا گیا ہے۔حالاں کہ ان دونوں مجالس میں بھی یک موضوعاتی گفتگو ہے۔مجالس کے عناوین پر نظر ڈالنے سے ہی ہمارے ذہن میں مصلح الامت کی شخصیت، فکر اور ان کے طریقۂ کار کا نقشہ واضح ہو جاتا ہے۔جلد ششم کے عناوین یہ ہیں: قیامت کا بیان، اعتصام باللہ، آدابِ مجلس، معیارِ مقصود ہے پیر مقصود، درجات، احکامِ ورزی، صفائی قلب کیسے بنیادی اصول، إن اللہ لا المحسنین، نعمتِ تعالیٰ، درجاتِ علما وصوفیہ، خلافت و اجازت، دین نہیں، ولایت کے خداوندی کی خلاف حاصل ہو؟ تبلیغِ دین کے یضیع أجر عافیت کی قدر کرو،

> آج قرآن وحدیث کے نام پر غیر نبوی فہمِ دین مختلف بینروں اور متعدد طریقوں سے عام کیا جا رہا ہے۔ایسے میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عوامی ذوق کی تشکیل کے لیے اُن بزرگوں کی تعلیمات کو عام کیا جائے جو قرآن وحدیث کا حقیقی اور نبوی ذوق رکھتے تھے۔

معاملات، حسنِ معاشرت، محبت کا معیار اتباع ہے، ہماری جملہ پریشانیوں کا قرآن ہی حل ہے، اللہ تعالیٰ سے تعلق کا آسان طریقہ، فرحِ بطر و فرحِ شکر، آج کسی کو نفس اور نفسانیت کا سمجھا دینا آسان نہیں اور علی گڑھ کی چودہ مجلسیں۔

ان عناوین کو دیکھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ جس خانقاہ میں سب سے زیادہ زور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع پر ہو، جہاں ایک مرشدِ برحق دن رات تعلق مع القرآن کا درس دیتا ہو، جہاں سنت سے ہٹی ہوئی ہر وہ چیز جو بظاہر مقدس دکھائی دیتی ہو مردود و ملعون قرار دی جائے، جہاں لوگوں کو زندگی گزارنے، معاملات کرنے، حقوق ادا کرنے اور ملنے جلنے کے طور طریقے روحانی اعمال کی طرح سکھائے جاتے ہوں، ایسی خانقاہ خانقاہِ نبوی سے کتنی قریب تر اور خانقاہ نما عمارتوں سے کتنی مختلف ہوگی۔یہی وجہ تھی کہ خانقاہِ مصلح الامت میں عام لوگوں کے ساتھ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمن محدث اعظمی، علامہ عبدالباری ندوی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحق حقی جیسی عبقری شخصیات کی نیاز مندانہ حاضری ہوتی رہتی تھی۔مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مصلح الامت کی مجالس کی کیفیت چند جملوں میں اس طرح بیان کی ہے:

> ”مجالس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، جو اس سفر کی اصل قیمت تھی، اس وقت ذرا قریب سے اور کچھ زیادہ غور سے مولانا کو دیکھنے کا موقع ملا، ایک اضطرابی و سیمابی کیفیت تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کل چین نہیں، مسلمانوں کے حالات، اخلاق و معاملات کے بگاڑ، صدق و اخلاص کی کمی اور ”نفاق“ کے کھلے آنکھوں مشاہدے نے بے قرار و مضطرب بنا رکھا ہے، اصلاح

حال اور دعوتِ فرار الی اللہ کا جذبہ قلب و دماغ و اعصاب پر مستولی ہوگیا ہے اور وہ حال ہے جو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے:

شعلہ ہا آخر زہر مویم دمید
رازِ من از پردۂ بیرون کشید

(آخر میرے جسم کے رویں رویں سے شعلے پھوٹنے لگے اور اس نے میرے راز کو پردے سے باہر نکال دیا۔)

(پرانے چراغ، جلد اول)

مختصر یہ کہ معارف مصلح الامت (جلد ششم) اور اس منصوبے کی ساتوں جلدیں علم و عرفان کا ذوق رکھنے والے اہل علم کو بھی مطالعے میں رکھنی چاہئیں اور دینی مزاج رکھنے والے عام مسلمان کو بھی۔ مصلح الامت کی ان مجالس کو مساجد و مدارس اور دینی مراکز میں پڑھ کر سنایا جانا چاہیے۔ اس سے دینی معلومات میں اضافہ بھی ہوگا، اسلام کا وسیع ترین نظام معاشرت بھی سامنے آئے گا، قرآن و حدیث کے باریک نکات بھی معلوم ہوں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حقیقی نبوی ذوق تشکیل پائے گا۔

آج قرآن و حدیث کے نام پر غیر نبوی فہمِ دین مختلف بینروں اور متعدد طریقوں سے عام کیا جا رہا ہے۔ ایسے میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عوامی ذوق کی تشکیل کے لیے اُن بزرگوں کی تعلیمات کو عام کیا جائے جو قرآن و حدیث کا حقیقی اور نبوی ذوق رکھتے تھے۔

شاہ اجمل فاروق ندوی

قرآن اور صاحب قرآن



کلام الٰہی ایمانی زندگی کا رہ نمائے کامل

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی صلاح و بہبود اور فلاح اخروی کی رہنمائی کے لیے نازل کی گئی آخری کتاب قرآن مجید رضائے الٰہی کے حصول کی راہ کے لیے ایسی مشعل ہدایت ہے کہ اس کی روشنی سے انسانوں کو کوئی استغنا نہیں اور جو بھی اس سے استغنا برتتا ہے وہ حقیقی اور دائمی کامیابی سے محروم ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ کلام الٰہی ہونے کی بنا پر مقدس کلام اور آسمانی مقام اور بلند و بالا مرتبہ رکھتا ہے؛ اسی لیے اس کی صرف تلاوت بھی عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور رضائے الٰہی کا ذریعہ بنتی ہے اور اس کے مضامین ومطالب دنیاوی زندگی میں صلاح اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور وہ اپنی اعلیٰ صفات وخصوصیات کی بنا پر حقائق و اسرار کا گنجینہ ہے، جس کے متنوع پہلو اور اسرار برابر کھلتے رہتے ہیں اور اس کے نئے نئے فوائد سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس

"اس کی صرف تلاوت بھی عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور رضائے الٰہی کا ذریعہ بنتی ہے اور اس کے مضامین ومطالب دنیاوی زندگی میں صلاح اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور وہ اپنی اعلیٰ صفات وخصوصیات کی بنا پر حقائق و اسرار کا گنجینہ ہے، جس کے متنوع پہلو اور اسرار برابر کھلتے رہتے ہیں اور اس کے نئے نئے فوائد سامنے آتے رہتے ہیں۔"

کی طرف اشارہ کے طور پر خود قرآن مجید میں کہیں اس کو "نور"، یعنی اعلیٰ روشنی کہیں اس کو "المبین"، یعنی بات کو واضح کرنے والا کہیں اس کو "حکیم"، یعنی حکمت و دانائی والا کلام، کہیں اس کو "عربی"، یعنی فصاحت و بلاغت کا کلام، کہیں پر اس کو "ذکری"، یعنی یاد دلانے والا کلام، کہیں اس کو "ہدی"، یعنی رہنمائی کرنے والا، کہیں اس کو "فرقان"، یعنی اچھے اور برے کا فرق بتانے والا، کہیں اس کو "رحمت"، یعنی اپنے ماننے والوں کے لیے خیر اور رحمت کا باعث بننے والا کلام، کہیں اس کو "شفاء"، یعنی باطنی خرابیوں سے نکالنے والا کلام، کہیں اس کو "ضیاء"، یعنی روشنی والا کلام، کہیں اس کو "مبارک"، یعنی برکت عطا کرنے والا کلام، کہیں اس کو "عزیز"، یعنی مضبوط اور غالب کلام، کہیں اس کو "کریم"، یعنی عزت دلانے والا کلام، کہیں اس کو "علی"، یعنی بلند مقام والا کلام، اور کہیں اس کو "ام الکتاب"، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری کائنات اور مخلوقات کے لیے طے کردہ ارادوں اور رایوں کے دفتر کا خصوصی حصہ قرار دیا گیا ہے، اس طریقے سے قرآن مجید ایسی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس کی متنوع صفات اور خصوصیات ہیں اور انسانی فلاح وصلاح کی ضرورت کے لیے اس سے زیادہ کارگر کوئی کتاب نہیں ہے۔

انسان کے مزاج اور خصوصیات میں جو تنوع ہے ان کی باریکیوں تک کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے؛ اس لیے کہ اس نے سب کو پیدا کیا اور ان میں خصوصیات اور باریکیاں رکھی ہیں۔ وہ اپنی اس عظیم کتاب قرآن مجید میں جس کو انسان کو سمجھانے کے لیے اور اس کو راہ ہدایت دکھانے کے لیے اس ذات اعلیٰ و برتر اور قادر عظیم نے نازل فرمایا۔ انسانوں کو انسان کے مزاجی تنوع اور نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے سمجھاتا اور رہنمائی کرتا ہے۔ اس سمجھانے اور اصلاح کی طرف متوجہ کرنے کے ایسے نمونے جن میں انسان کے مزاجی اور نفسیاتی تنوع کی رعایت ہے، اس کے کلام مجید میں بہت مؤثر اسلوب میں پائے جاتے ہیں، اور وہ اس کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں، مثلاً سورہ تکاثر میں بیان ہے کہ حق سے منحرف انسان میں خود غرضی اور خواہش نفس کے لیے فکرمندی وشوق اتنا بڑھ جایا کرتا ہے اور اس سلسلے میں وہ ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح منہمک ہو جاتا ہے کہ بالآخر اس کی موت کا وقت آجاتا ہے، اور اس وقت اس کو اپنے برے انجام کا پتا چلتا ہے کہ ہائے کیا ہوا، اور پھر اپنی غفلت کا انجام جہنم کی شکل میں دیکھتا ہے، اور یہ کہ اب اپنے رب کے سامنے جواب دہی اور حساب دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ۔ حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ۔ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ۔ ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ۔ (سورۃ التکاثر)

تم کو (مال و دولت کی کثرت کی فکر) نے غافل کر دیا ہے؛ یہاں تک کہ تم قبروں تک پہنچ گئے، دیکھو تمھیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، پھر دیکھو تمھیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، دیکھو اگر تم جانتے (یعنی) علم الیقین (رکھتے تو غفلت نہ کرتے)، تم دوزخ دیکھو گے، پھر اس کو ایسا دیکھو گے کہ عین الیقین (آجائے گا)، پھر اس روز تم سے (دنیا میں ملی ہوئی) نعمت کے بارے میں پرسش ہوگی۔

اسی طرح سورہ ماعون میں بھی اللہ نے ایسے انسان کی تصویر ظاہر کی ہے، جو خود غرضی اور من مانی زندگی میں ڈوبا ہوا ہے، اور اپنے رب کی اطاعت اور حق بات کو قبول کرنے سے بالکل باغی ہو جاتا ہے، وہ اوّلاً اپنے رب کے احکام کا انکار کرتا ہے، اور اس کا رویہ یہ ہو جاتا ہے کہ اپنے علاوہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی سے گریز کرتا ہے، یتیم کو دھتکارتا اور غریب کو کھانے کی مدد دینے کے لیے نہیں کہتا، اور (اپنے رب کی عبادت) نماز سے غفلت برتتا ہے، اور دکھاوے کے کام میں لگا رہتا ہے، اور چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی کسی کو دینے میں بخل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ۔ فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ۔ وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ۔ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ۔ الَّذِينَ هُمْ يُرَاؤُونَ۔ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ۔ (سورۃ الماعون)

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے، یہ وہی بدبخت ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا، تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے، جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں، اور

برتنے کی چیزیں عاریتہً نہیں دیتے۔

اسی طرح سورۂ والعصر دیکھیے: اس مختصر سورہ میں اللہ تعالیٰ کامیاب انسان کی کیفیت پیش فرماتا ہے، زندگی کے عظیم نقصان سے وہی انسان بچتا ہے جس نے اپنے رب کے احکامات کو تسلیم کیا ہو، اور ان کے مطابق اچھے اعمال اختیار کیے ہوں، اور ایک دوسرے کو اچھی باتوں کی طرف متوجہ کرتا رہا ہو، اور تبلیغ حق میں اس کو جو پریشانیاں لاحق ہوتی ہوں یا مخالفتیں ہوتی ہوں تو ان کو بسر وچشم برداشت کیا ہو، اور برداشت کرنے کا آپس میں مشورہ دیا ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْعَصْرِ۔ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ۔ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

(سورۃ العصر)

زمانہ کی قسم! انسان نقصان میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین کرتے رہے اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔



اسی طرح دیکھا جائے تو قرآن مجید میں بکثرت مثالیں انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے سلسلے میں انسانوں کے مزاج اور ان کی طبیعتوں کے حوالے سے بڑی متنوع اور پُر اثر طور پر بیان کی گئی ہیں، ان کے ذریعہ قرآن مجید ہر طرح کے انسانوں کی نفسیات کی رعایت کے ساتھ ان کی ہدایت کا سامان کرتا ہے اور اس طریقے سے انسانوں کی ہدایت کے لیے بہت کامل اور مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے، اور انسانی فطرت کا ایسا لحاظ کرتا ہے کہ سننے والے کے دل میں بات اتر جائے اور کسی بھی قسم کا انسان ہو اس کو اس کے خیر کی بات اس میں مل جائے اور اس کو لغزش سے بچانے والی بات اس کے سامنے آجائے، اس طرح یہ انسانوں کی ہدایت اور فلاح وبہبود کے لیے ایسی کامل رہنما کتاب ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔

عربوں کی زندگی تمدن سے دور ہونے اور معاشی حالت کی کمزوری کی وجہ سے جسمانی محنت اور جفاکشی پر مجبور کرتی تھی اور خودداری اور قومی غیرت وحمیت بہت جلد جنگ پر آمادہ کرتی تھی، خشک علاقوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی کچھ قدریں بن گئی تھیں، جس سے آپس میں لڑائیوں کی نوبت آتی تھی، اس کے ساتھ ساتھ مسافروں کی مدد اور خاطر داری خشک علاقوں میں ان کی ضرورت بن

گئی تھی، جس کے سبب مسافر و مہمان کے ساتھ بہت زیادہ ہمدردی کا جذبہ عام تھا اور آپس کی لڑائیاں بعض وقت معاشی ضرورت کے لیے برسہابرس کے لیے ہوتی رہتی تھیں، اس کے لیے ان کو ہر وقت تیار رہنا پڑتا تھا، اس ضرورت کے لیے ان کو اولاد کی کثرت اور جنگی سامان رکھنے کی ضرورت تھی، جس میں لڑکوں کا کردار بہت اہم تھا، اچھے سے اچھا گھوڑا جو جنگ میں چستی و چابک دستی میں ممتاز ہو، اس کو دوسری محبوب چیزوں سے بھی زیادہ عزیز ہوتا اور گھوڑے کی خوبیوں پر فخر کرتے تھے، جنگ میں اپنی اور گھوڑے کی کارگزاری ان کی مجلسوں کو گرما دیتی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت پر آمادہ کرنے کے سلسلے میں ان کی نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے معجزانہ انداز میں سورہ ''العادیات'' میں بات کہی کہ تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جن کی تیزی اور برق رفتاری ایسی کہ ان کی ٹھوکروں سے چنگاریاں اڑیں اور منہ میں تھوک بھر جائے اور وہ صبح ہوتے ہوتے دشمن پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اور ان کے قدموں سے غبار اڑنے لگتا ہے اور دشمن کے مجموعے کے بیچ میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کے ذہنوں اور دلوں کو موہ لیتے ہوئے اور طبیعتوں میں شوق کو ابھارتے ہوئے فرمایا کہ انسان بھی کتنا ناشکرا ہے اور وہ اپنی ناشکری کو خود بھی اچھی طرح دیکھ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے، یعنی ایسے دلچسپی اور شوق کے حالات اور سامان حسن عطا کیے اس پر بھی وہ اس کی اطاعت اور شکرگزاری کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور انسان فائدہ کی طلب میں بہت آگے چلا جاتا ہے کہ جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے اور ان لوگوں کے کرتوت سامنے لائے جائیں گے اس وقت اللہ تعالیٰ سمجھ لے گا:

وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحاً۔ فَالْمُورِيَاتِ قَدْحاً۔ فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحاً۔ فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعاً۔ فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعاً۔ إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ۔ وَإِنَّهُ عَلَى ذَلِكَ لَشَهِيدٌ۔ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ۔ أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ۔ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ۔ إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ۔ (سورۃ العادیات: ۱۱-۱)

قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو دوڑتے ہیں ہانپتے ہوئے، پھر وہ چنگاریاں جھاڑتے ہیں ٹاپ مار کر، پھر وہ تاخت و تاراج کرتے ہیں صبح کے وقت، پھر وہ اڑاتے ہیں اس موقع پر گرد و غبار، پھر وہ اسی حالت میں جا گھستے ہیں کسی لشکر میں، بلاشبہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے اپنے رب کا، اور وہ خود اس پر گواہ بھی ہے اور یقیناً یہ مال کی محبت میں بڑا سخت ہے، تو کیا اس کو معلوم نہیں (ہونا کی اس وقت کی) کہ جب نکال باہر کیا جائے گا ان (مردوں) کو جو (پڑے ہیں) قبروں میں، اور کھول کر رکھ دیا جائے گا وہ سب کچھ جو کہ (مخفی و مستور) ہو گا سینوں میں۔ بلاشبہ ان کا رب اس دن ان سے پوری طرح باخبر ہو گا۔

خود اپنے ہاتھ سے تراشے مجسموں کو خدا سمجھ کر ان کی عبادت کیے جانے کا تذکرہ ایسے نفسیاتی انداز میں اور نفسیاتی ترکیب کے ساتھ کرتے ہوئے سورۂ حج میں فرماتا ہے کہ اے لوگو! یعنی شکر نہ کرنے والو، بیشک جس کو تم اپنی حاجت کے لیے خدا سمجھ کر پکارتے ہو اللہ کو چھوڑ کر، ان کا تو حال یہ ہے کہ مکھی جیسی حقیر چیز کو بنا نہیں سکتے اور پھر اگر یہ سب مل کر بھی ایسا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، پیدا کرنا تو بڑی بات، مکھی ان کی مٹھائی کو کھانے لگے یا اٹھا لے جائے تو اس کو چھڑا بھی نہیں سکتے، ان سے مانگنے والے اور جن سے مانگ

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی مزاج، ضروریاتِ زندگی اور اس کے تمام تر تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے انسانوں کو مخاطب کیا ہے، چناں چہ اس نے اس کی ہدایت کے لیے اس زبان کا انتخاب فرمایا جو براہ راست مخاطب لوگوں کی جانی پہچانی زبان تھی حتیٰ کہ ان کے اَن پڑھ کو بھی اس کے سمجھنے کی صلاحیت حاصل تھی، اس زبان کے الفاظ، اسلوب بیان ایسے جو اُن کی انسانی فہم وادراک کے عین مطابق ہیں، ان کا قرآن مجید میں لحاظ ہے، اور وہ انسان کی نفسیات اور عقل وفہم کو اپیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک بیک وقت دل وعقل دونوں کے ساز کو چھیڑتا اور متاثر کرتا ہے، اس کی یہ تاثیر معجزاتی اَثیر ہے، کسی بھی انسانی کلام کے اسلوب و بیان میں یہ تاثیر نہیں پائی جاتی اور نہ آج تک تاریخ اس کی نظیر پیش کرسکی ہے۔ اس طرح قرآن پاک ایک سراپا معجزہ ہے، اگرچہ اس سے فائدہ اٹھانا انسانی عقل وفہم سے ماورا نہیں ہے، لوگ اسے پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ۔ (العنکبوت: ۴۳)

اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔

چناں چہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کا سمجھنا اس کی علمی صلاحیت کی بنیاد پر جو اس کے پروردگار کی طرف سے بطور خاص اس کو دی گئی ہے، آسان ہوجاتا ہے۔

قرآن پاک میں علم کے بارے میں آیا ہے:

قْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ (العلق: ۵،۳)

پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

اور پھر فرمایا گیا:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ (الزمر: ۹)

کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہوسکتے ہیں۔

پھر کہا گیا:

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔ (الفاطر: ۲۸)

خدا سے تو ان کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو علم ایک ایسی کلید کے طور پر دیا ہے کہ جس کے ذریعے انسان مختلف حالات وکوائف جان سکتا ہے اور مختلف شعبہ حیات میں نئے نئے امکانات تلاش کرسکتا ہے۔

علم کے متعلق قرآن کی توجہ دہانی ہے کہ یہ امت عربی جو امّی تھی، علم کا اہتمام کیا کرے، تاکہ وہ اس کے لیے گنجینۂ حیات ثابت ہو اور زندگی کی فلاح وبہبود اور ان تمام امکانات تک رسائی کا ذریعہ ثابت ہو، جو اُن کے لیے معاون ومدد ثابت ہوں۔

رہے ہیں کتنے کمزور ہیں اور یہ پروردگار عالم اللہ تعالیٰ کے مقام کو نہیں سمجھتے:

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ۔ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ۔ (سورۃ الحج: ۷۴، ۷۳)

بیشک جن ہستیوں کو تم لوگ پوجتے پکارتے ہو اللہ کے سوا وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے، اگرچہ اس کی کوشش کے لیے وہ سب اکٹھے بھی ہو جائیں اور مکھی بنانا تو دور کی بات ہے، ان کا حال تو یہ ہے کہ اگر وہ مکھی ان سے کچھ چھین لے تو یہ اس کو بھی اس سے چھڑا نہیں سکتے، کتنا کمزور ہے چاہنے والا اور کتنا کمزور ہے وہ جس سے مدد چاہی جاتی ہے، ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق تھا بیشک اللہ تعالیٰ بڑا ہی قوت والا نہایت ہی زبردست ہے۔

> اس طرح اس کتاب مقدس میں دل و دماغ دونوں کو سامنے رکھ کر باتیں کی گئی ہیں، جس کے سننے پر آدمی بالکل مبہوت ہو جاتا ہے اور قائل ہو جاتا ہے، جیسا حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے اور جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لبید سے گفتگو کے موقع پر قرآن کی آیات کا اثر ہوا۔ قرآن کا یہ معجزاتی انداز دعوتی کام کرنے والوں کے سامنے بہترین نمونہ سامنے لاتا ہے۔

ان آیتوں میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ذہن کو مطمئن کرنے میں بڑی نفسیاتی ترکیب رکھی ہے کہ انسان کی طاقت اتنی بھی نہیں کہ ایک چھوٹی سی مکھی جیسی کمزور چیز کو بنا سکے، اور ان کے رب کریم نے پوری کائنات بنائی، اور سب کو بنایا اور سب انسان مل کر چھوٹی سی بات نہیں کر سکتے، بنانا تو بڑی بات ہے، جن کو یہ پوجتے ہیں، وہ تو مکھی کو اڑا بھی نہیں سکتے۔ قرآن میں انسان کی نفسیات اور متاثر ہونے کی جو کیفیات ہیں، اس کے کلام مقدس میں پائی جاتی ہیں، کہ بات دل میں اتر جائے اور انسان نے جو رسم اور جہالت میں اپنے ذہن سے افسانے بنا رکھے ہیں اس کا طلسم پاش پاش ہو جاتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے۔ قرآن مجید میں قارئین اور سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی حیثیتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، مثلاً سر بلندی کے لیے الگ الگ مضمون کی طرف اختیار کرنے والا لفظ، جب نافرمانوں کے لیے استعمال کیا، جیسے فرعون تو علو کا لفظ اختیار کیا جس کا ماضی علا اور مضارع یعلو إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ، یعنی ''فرعون نے سر بلندی اختیار کی''، اس میں اس کا اشارہ ہے، نافرمانی ظلم اور خود اپنی ذات اور اس کی بلندی کے لیے، اور اچھی بلندی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے علا کے اشتقاق کو اختیار کیا اور اپنے لیے عالی کے بجائے علیّ اختیار کیا فرمایا: ''علیّ کبیر''، اور جیسا کہ آیت الکرسی میں ہے ''وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ''۔ اسی طرح ہوا کے لیے، جس ہوا سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اس کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا، ریاح، اور مغفرت اور آفت والی ہوا کے لیے واحد کا لفظ ریح استعمال کیا مختلف موقعوں پر مترادف الفاظ میں سے ایسے

لفظ اختیار کیے ہیں، کہ اس کی کیفیت بھی سامنے آجائے، جیسے سورہ مریم کی آخری آیتیں اس میں جو آواز بنتی ہے اس سے پوری کیفیت بھی سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح نعمت اور انعام کے الفاظ ہیں، ان کے لفظوں کے استعمال میں نعمت بکسر النون اللہ تعالیٰ نے خود اپنی پسند کے موقع پر استعمال کیا ہے، لیکن وہ نعمت جو دنیاداری اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے لیے ہو وہ نون کے فتح کے ساتھ استعمال کیا ہے، جیسے کافروں اور خالص دنیا پسندوں کے لیے فرمایا: (ونعمة كانوا فيها فاكهين) اسی طرح ''خطا'' کا لفظ ہے، دنیاوی معاملات کے لیے ثلاثی مجرد اور دینی معاملات کے لیے ثلاثی مزید فیہ کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں، اس طرح اور بھی بہت سی مثالیں ہیں، یہاں پر چند پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اس طرح اس کتاب مقدس میں دل و دماغ دونوں کو سامنے رکھ کر باتیں کی گئی ہیں، جس کے سننے پر آدمی بالکل مبہوت ہو جاتا ہے اور قائل ہو جاتا ہے، جیسا حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے اور جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لبید سے گفتگو کے موقع پر قرآن کی آیات کا اثر ہوا۔ قرآن کا یہ معجزاتی انداز دعوتی کام کرنے والوں کے سامنے بہترین نمونہ سامنے لاتا ہے۔

کلام الٰہی کی عظمت اور انسانوں کے لیے اس کی ضرورت کی طرف خود اللہ رب العزت نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔ (سورہ حشر: ۲۱)

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے خوف سے دبا اور پھٹا جا رہا ہے اور ہم اس کی مثالوں کو لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں؛ تاکہ غور کریں اور سمجھیں۔

پھر قرآن پاک کی جو سب سے پہلی آیت نازل ہوئی، اس آیت سے انسان کی اعلیٰ ترین صلاحیت یعنی علم سے کام لینے کا حوالہ دیا گیا ہے، علم زبان کے ذریعے ہی انسانوں کو حاصل ہوتا ہے اور اس کی بدولت زمین پر موجود تمام مخلوقات میں انسان کو امتیازی شان اور فوقیت حاصل ہے اور علم رب العالمین کا وہ عطیہ ہے جس سے انسان مادی اور معنوی زندگی میں ہمہ جہت ترقی کے لیے استفادہ کرتا آیا ہے اور آئندہ بھی اس کا محتاج رہے گا۔

قرآن مجید جن عظیم خصوصیات اور بے شمار فوائد کی حامل کتاب ہے، ان میں انسان کی ہدایت اور انھیں تاریکی سے روشنی کی طرف لانے کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

الٓر. كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ۔ (ابراھیم: ۱)

یہ ایک پُرنور کتاب ہے، اس کو ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ یعنی ان کے پروردگار کے حکم سے غالب اور قابل تعریف (خدا) کے رستے کی طرف۔

اللہ رب العزت نے قلم کی قسم کھائی ہے اور قلم وہ شئے گراں مایہ ہے جو انسان کے لیے علوم وفنون کے نئے نئے دریچے کھولتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُونَ (القلم: ۱)

ن قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔

> کلام الٰہی ایمانی زندگی کا رہنمائے کامل اور پوری انسانیت کے لیے نجات دہندہ اور کتاب ہدایت ہے کہ ایک طرف وہ ایمان اور تقویٰ کی زندگی گزارنے والوں کو اعلیٰ زندگی عطا کرتا ہے اور عام انسانوں کو جو ہدایت سے بالکل دور ہیں ہدایت کا راستہ بتاتا ہے۔ اس لیے اس کو ایک طرف ھُدًی لِّلْمُتَّقِینَ کہا گیا اور دوسری طرف ھُدًی لِلنَّاسِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید کو اپنے خزانۂ علم وارادہ سے جس کو ''الکتاب'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اسی کا ایک حصہ بنایا ہے، اس کا یہ خزانۂ علم وارادہ وہ علم ہے جو کائنات کے پیدا کرنے اور بنانے والے کے ساتھ مخصوص ہے، قدرت الٰہی وصفات الٰہی کا علم ایسا بحر بیکراں ہے جس کی نہ تو کوئی ابتداء کا اندازہ کرسکتا ہے اور نہ انتہاء کا۔ اللہ رب العزت نے اپنی اسی کتاب علم وعرفاں کا ایک چھوٹا سا حصہ قرآن پاک کی شکل میں دنیائے انسانی کو عطا کیا۔ ارشاد باری ہے:

الٓمٓ ذَٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِینَ۔ (البقرۃ: ۲، ۱)

یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں کہ کلام خدا ہے، خدا سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔

یہی وہ علم ہے جس کا ایک حصہ اللہ کی اس کتاب قرآن مجید میں ہے، یہ حق و باطل کے درمیان تفریق کرنے والا پاکیزہ کلام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اپنے بندوں کے لیے نازل فرمایا؛ تاکہ ان کی دنیوی واخروی سعادت کا ذریعہ بنے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نصیحت کی ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ بارگاہِ ایزدی میں دنیا وآخرت کی کامیابی کا طلب گار ہو اور اپنے رب سے ان الفاظ میں دست بدعا ہو:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (البقرۃ: ۲۰۱)

پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت سے نواز اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

اور پھر کہیے کہ:

رَبَّنَا وَ آتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادِ۔ (آل عمران: ۱۹۴)

اے پروردگار! تو نے جن جن چیزوں کے ہم سے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے وعدے کیے ہیں، وہ ہمیں عطا فرما اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کر، کچھ شک نہیں کہ تو خلاف وعدہ نہیں کرتا۔

یہ آیات انسان کے اصل مقاصد زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ وَ مَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ۔ (النور: ۳۴)

اور ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں نازل کی ہیں اور جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کی خبریں اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت۔

اس کے ذریعہ قرآن میں مذکور تین قسم کے مضامین کا اشارہ ملتا ہے:

اول: قرآن پاک کی وہ آیات جو بالکل واضح ہیں، جن سے ہر کوئی استفادہ کرسکتا ہے، جو پڑھتا اور سمجھتا ہے۔ یہی وہ آیات ہیں جو زندگی کے بالکل سیدھے اور مثالی طریق زندگی کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یہ آیات مظاہر کائنات اور متنوع علوم وفنون سے پُر ہیں، نیز یہ آیات ایسے کائناتی حقائق پر دلالت کرتی ہیں جو مسلم اور تحقیق شدہ ہیں اور انسان کو صحیح عقیدہ اور دنیوی واخروی راہ نجات کا پتہ دیتی ہیں۔

دوم: قرآن پاک میں ان پچھلی امتوں کے واقعات کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے اپنی جانب بھیجے گئے انبیاء ورسل کی نصیحت کو بالائے طاق رکھ دیا اور ان کی ایک نہ سنی، انھوں نے نہ ہی کائناتی دلائل و برہان سے بھی سبق سیکھا، چناں چہ تباہی و بربادی ان کا مقدر بن گئی۔

سوم: قرآن پاک میں نصیحت اور موعظت کے ایسے اسلوب ملتے ہیں، جو پرہیزگاروں کے دلوں کو وا کر دیتا ہے، انھیں اعمال خیر وفلاح پر ابھارتا ہے، قرآن پاک کی یہ آیات اسی جانب اشارہ کرتی ہیں:

وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ۔ (الزمر: ۲۷)

اور ہم نے لوگوں کے سمجھانے کے لیے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں؛ تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

اسی طرح دوسری آیت:

قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا۔ (الفرقان: ۶)

کہہ دو کہ اس نے اس کو اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے، بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اللہ رب العزت نے اپنے کلام کے جاہ وجلال کے اور اعجاز اسلوب کا بھی ذکر فرمایا اور اس بات کا بھی ذکر فرمایا کہ قرآن مجید

آیات مغیبات پر مشتمل ہے، جس کا انسانی حواس ادراک کرنے سے عاجز وقاصر ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

تِلْکَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَیْبِ نُوحِیهَا إِلَیْکَ مَا کُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُکَ مِن قَبْلِ هَذَا فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِینَ۔ (ھود: ۴۹)

یہ (حالات) منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں اور اس سے پہلے نہ تم ہی ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم (ہی ان سے واقف تھی) تو صبر کرو کہ انجام پرہیزگاروں کا ہی (بھلا) ہے۔

قرآن مجید میں معنوی اور لفظی دونوں لحاظ سے انسانی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اعلیٰ انداز کلام اور انسانی نفسیات کی رعایت اختیار کی گئی ہے اور اس کی آیات پر غور وتدبر سے ایسے نکتے سامنے آتے ہیں کہ غور کرنے والے کو حیرانی ہو جاتی ہے اور قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید کو جو بھی کھلے دل سے پڑھتا ہے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اس پر ایمان لے آتا ہے اور آمنا و صدقنا کہتا ہے، یہ انسان کی زندگی کو راہ راست پر لانے کے سلسلے میں سب سے بڑا رہبر اور تابناک مشعل راہ ہے۔

کلام الٰہی ایمانی زندگی کا رہنمائے کامل اور پوری انسانیت کے لیے نجات دہندہ اور کتاب ہدایت ہے کہ ایک طرف وہ ایمان اور تقویٰ کی زندگی گزارنے والوں کو اعلیٰ زندگی عطا کرتا ہے اور عام انسانوں کو جو ہدایت سے بالکل دور ہیں ہدایت کا راستہ بتاتا ہے؛ اس لیے اس کو ایک طرف هُدًى لِّلْمُتَّقِینَ کہا گیا اور دوسری طرف هُدًى لِلنَّاسِ سے تعبیر کیا گیا ہے؛ اس لیے ایمانی زندگی رکھنے والوں کی یہ بڑی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس کو تمام انسانوں تک پہنچانے کی کی طرف بھی متوجہ ہوں؛ تاکہ دوسرے اس آسمانی فیض سے محروم نہ ہوں اور ٹھوکر کھانے سے بچیں۔



اِبلاغِ عامّہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں

ڈاکٹر احسان الحق

اِبلاغ عربی زبان کے بابِ افعال سے بطور مصدر مستعمل ہے جس کا معنی ہے: پہنچا دینا۔ باب تفعیل سے یہی مصدر 'تبلیغ' کے وزن پر آتا ہے جس کا مفہوم خوب اچھی طرح پہنچا دینا ہے۔ اِبلاغ عامہ کی اصطلاح Mass Communication کا مفہوم بھی یہی ہے کہ عام لوگوں تک بات پہنچائی جائے۔ اس اصطلاح سے پہلے جرنلزم کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن اس کا دائرہ محدود تھا۔ یعنی صرف صحافتی دنیا میں شائع ہونے والی خبریں مراد تھیں۔ اب اِبلاغِ عامہ میں اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سی ڈیز، فلم، انٹرنیٹ وغیرہ سب شامل ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت خبر کی اشاعت کا بڑا ذریعہ شاعری، اسواق (میلے)، ندوات (مقامی مجلسیں) اور سمرات (رات کی نشستیں) ہوا کرتی تھیں۔ قرآن نے اِبلاغ کے ضمن میں اتنی جامع رہنمائی دی ہے جو ہر دور پر منطبق (Apply) ہوتی ہے۔

قرآنی ہدایات کی روشنی میں اِبلاغ کے منصب پر فائز تمام شخصیات، صحافی، براڈ کاسٹر، میڈیا سے وابستہ شخصیات، داعی، اساتذہ وغیرہ سب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بقدر استطاعت خبر کے اِبلاغ میں درج ذیل باتوں کی پابندی کریں:

(۱) انھیں انسانیت کا خیر خواہ ہونا چاہیے۔ (۲) انھیں امانت دار ہونا چاہیے۔
(۳) انھیں بے باک ہونا چاہیے۔ (۴) ان کا اِبلاغ بے رنگ نہیں، بلکہ بامقصد ہونا چاہیے۔

قرآن اور صاحبِ قرآن

اِبلاغ کے بنیادی اصول

مستند اور ٹھوس حقیقت: پہلا اصول یہ دیا کہ خبر بے لگام نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اس کا ایک حوالہ ہونا چاہیے۔ اور وہ حوالہ اللہ کی ربوبیت پر ایمان کی دعوت کے ساتھ انسانیت کی خیر خواہی اور راست بازی کا قیام ہے۔

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ. (اعراف:۶۸)

(حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا) کہ میں تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، اور تمھارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔

واضح اور ابہام سے پاک: دوسرا اصول یہ دیا کہ خبر واضح ہو۔ اس میں کسی قسم کا ابہام نہ ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے قرآن

حکیم بلاغ کا لفظ استعمال کرتا ہے جس کا مفہوم واضح پیغام (اعلامیہ) ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ لِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ. (ابراھیم: ۵۲)

یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے اور یہ بھیجا گیا ہے اس لیے کہ اُن کو اس کے ذریعے خبردار کیا جائے اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا بس ایک ہی ہے اور جو عقل رکھتے ہیں، وہ ہوش میں آجائیں۔

کہیں اِبلاغ کے ساتھ مبین کا لفظ استعمال ہوا۔

وَ مَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ. (یٰسٓ: ۱۷)

اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

مؤثر اِبلاغ: تیسرا اصول یہ دیا گیا کہ اچھی خبر سے آگاہ کر دینا کافی نہیں ہے، بلکہ اسے بار بار نشر کرنا اور دلوں کی گہرائی میں اُتارنا ضروری ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائدہ: ۶۷)

اے پیغمبرؐ! جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔

یہ فریضۂ اِبلاغ پوری دل سوزی سے ادا کیا جائے۔

وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا. (النساء: ۶۳)

انھیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اُتر جائے۔

جرأت اور بے خوفی: چوتھا اصول یہ دیا گیا کہ سچا پیغام پہنچانے میں خوف کو قریب نہ آنے دیا جائے۔

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (احزاب: ۳۹)

یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اُسی سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

مثبت طرزِ فکر کا فروغ: پانچواں اصول یہ دیا گیا کہ معاشرے میں ایسی خبر رسانی ہو جس سے طبیعتوں میں ہیجان انگیزی اور انتشارِ ذہنی کے بجائے امن و آشتی اور مثبت طرزِ فکر کو فروغ حاصل ہو۔

وَ هُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَ هُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ. (الحج: ۲۴)

اور یہ وہ لوگ ہیں جنھیں پاکیزہ کلموں کی ہدایت دی گئی ہے اور یہ وہ ہیں جنھیں پسندیدہ راستے کی طرف رہنمائی دی گئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا. (احزاب: ۷۰)

اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ (النور: ۱۹)

بے شک جو لوگ مومنوں کے درمیان فحش باتوں کو پھیلانا پسند کرتے ہیں، ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

اِبلاغ کا منفی پہلو

اِبلاغ میں جن باتوں سے روکا گیا ہے (منہیات) وہ حسب ذیل ہیں:

جھوٹ سے اجتناب:

وَ اجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ. (الحج: ۳۰)

اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو۔

خبر کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا: بنی اسرائیل کی مذمت میں ارشاد ہوا کہ انھیں شہر میں داخل ہوتے وقت جس کلمے کی ادایگی کا حکم دیا گیا، انھوں نے توڑ مروڑ کر اسے کچھ کا کچھ کر دیا۔

فَبَدَّلَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَیۡرَ الَّذِیۡ قِیۡلَ لَہُمۡ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ. (البقرۃ: ۵۹)

مگر جو بات ان سے کہی گئی تھی، ظالموں نے بدل کر اُسے کچھ اور کر دیا۔ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔

غیر ذمے دارانہ رپورٹنگ سے گریز: اسلام نے خوف اور امن کی غیر ذمہ دارانہ خبروں کی رپورٹنگ سے گریز کی ہدایت کی ہے۔ منافقین کی بدعادات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَ اِذَا جَآءَہُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِہٖ (النساء: ۸۳)

یہ لوگ جہاں کہیں اطمینان بخش یا خوف ناک خبر سن پاتے ہیں، اُسے لے کر پھیلا دیتے ہیں۔

حکم دیا گیا:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا (الحجرات: ۶)

اے اہلِ ایمان! اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو۔

دھوکا دہی اور چربہ سازی کی ممانعت: کسی کی تحریر کو بغیر حوالے کے اپنے نام سے نقل کر دیا جائے، یا اصل مصنف کی طرف وہ کچھ منسوب کر دیا جائے جو اس نے نہ کہا ہو۔ ارشاد ہے:

فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡہِمۡ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ ہٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ لِیَشۡتَرُوۡا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ فَوَیۡلٌ لَّہُمۡ مِّمَّا کَتَبَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ وَیۡلٌ لَّہُمۡ مِّمَّا یَکۡسِبُوۡنَ ۝ (البقرۃ: ۷۹)

پس ہلاکت و بربادی ہے ان لوگوں کے لیے جو کتاب اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے وہ تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں۔ پس بربادی ہے اس وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور بربادی ہے ان کے لیے اس کے سبب جو وہ کماتے رہے ہیں۔

حوالہ دی گئی آیات شانِ نزول کے اعتبار سے مختلف پس منظر رکھتی ہیں مگر قرآن حکیم کا ایک حوالہ آفاقی ہدایت ہے۔ جو اشارتاً زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ خود وحی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں 'خبر' کہا۔

اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا سَاٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِخَبَرٍ (النمل:۷)

مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے، میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں۔

خود سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حدیث میں 'مخبر صادق' (سچی خبر دینے والا) کا لقب استعمال ہوا۔

ان قرآنی ہدایات کی روشنی میں اِبلاغ کے منصب پر فائز تمام شخصیات، صحافی، براڈ کاسٹر، میڈیا سے وابستہ شخصیات، داعی، اساتذہ وغیرہ سب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بقدر استطاعت خبر کے اِبلاغ میں درج ذیل باتوں کی پابندی کریں:

(۱) انھیں انسانیت کا خیر خواہ ہونا چاہیے۔
(۲) انھیں امانت دار ہونا چاہیے۔
(۳) انھیں بے باک ہونا چاہیے۔
(۴) ان کا اِبلاغ بے رنگ نہیں، بلکہ بامقصد ہونا چاہیے۔

خبر کے ذیل میں درج ذیل باتوں کی پابندی کرنی چاہیے:

(۱) مثبت پہلوؤں کو بھی خبر میں نمایاں مقام دیا جائے۔
(۲) پاکیزہ بات کہی جائے۔
(۳) جھوٹ سے بچا جائے۔
(۴) بات سیدھے سادے انداز میں کی جائے۔
(۵) بات دل سے کہی جائے۔
(۶) بات ذمہ دارانہ طریقہ سے کی جائے۔

اگر ان اصولوں کو اِبلاغ عامہ کے ادارے اپنالیں تو قوم کو انتشارِ ذہنی اور اضطرابِ فکری سے بچایا جاسکتا ہے اور اسے ایک صحیح سمت دی جاسکتی ہے، اس لیے کہ درست سمت کے تعین کے بغیر دائروں کے سفر میں قوم کی نسلوں کی نسلیں بھٹکتی رہیں گی۔

. . .



علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فہمِ قرآن کے اصول

پروفیسر احسان اللہ فہد فلاحی

قرآن جہاں اپنی ادبی فصاحت و بلاغت میں ایک عظیم الشان معجزہ ہے، وہیں اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے بھی دنیا کی تمام کتابوں پر عظیم الشان فوقیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ قرآن کا اعجاز قرآن کے مقاصد میں سے نہیں بلکہ اس کے لوازم میں سے ہے۔ قرآن کا مقصد انسانیت کو صحیح راہ دکھانا ہے۔ یہ مسلمانوں کی بدنصیبی ہے کہ وہ کتاب اللہ کو کتابِ ہدایت سمجھنے کے بجائے بحث و جدل، علمی ورزش اور اظہارِ قابلیت کا ذریعہ بنا چکے ہیں۔ پہلے یونانی فلسفہ، ایرانی اوہام و خرافات اور ہندستانی تصوف کی بھول بھلیوں میں علمائے تفسیر بھٹک رہے تھے۔ آج یورپ کی ذہنی غلامی نے ان کی عقلوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور وہ مغربی افکار و نظریات کو کتاب اللہ سے زبردستی ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ قرآن پاک بنیادی طور پر نہ عقلیات کی کتاب ہے، نہ سائنس کی، وہ

> **شیخ الاسلام کے نزدیک فہمِ قرآن کا بہترین طریقہ یہ ہے:**
> **(۱) قرآن کو قرآن کے ذریعہ سمجھا جائے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے افہام و تفہیم کی خاطر اسرار و حکم کو گوناگوں پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ (۲) سنتِ نبویؐ اور احادیثِ نبویؐ کی مدد سے قرآن کا فہم کیا جائے۔**

تو کتابِ ہدایت ہے۔ قرآن پاک بالکل آغاز ہی میں اپنے مقصد اور نصب العین کی خود ہی وضاحت کرتا ہے:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (البقرۃ: ۲)

''یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں، ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

قَدْ جَآئَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ۔ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (المائدۃ: ۱۵-۱۶)

''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں، سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے، اور راہِ

راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔"

قرآن پاک سے ہدایت حاصل کرنے کے کچھ اصول وآداب ہیں۔ محض تبرک کے طور پر قرآنی الفاظ کی تلاوت کر لینا اور معانی کی طرف دھیان نہ دینا صحابہ کرامؓ اور اسلافِ عظام کا طریقہ نہ تھا۔ یہ غلط تصور تو اس وقت سے رائج ہوا جب لوگوں نے قرآن کو کتابِ ہدایت ماننے کے بجائے اسے حصولِ برکت کی کتاب سمجھنا شروع کیا۔ علما اور اسلاف نے قرآن سے صحیح استفادہ کے لیے کچھ اصول اور وسائل ناگزیر قرار دیے ہیں جن کو نظر انداز کر کے فہمِ قرآن کی راہیں ہموار نہیں ہو سکتیں۔ شیخ الاسلام احمد بن عبد الحلیم بن تیمیہؒ (۶۶۱-۷۲۸ھ) نے فہمِ قرآن کے مندرجہ ذیل اصول بتائے ہیں:

۱- شیخ الاسلام کے نزدیک فہمِ قرآن کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کو قرآن کے ذریعہ سمجھا جائے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے افہام و تفہیم کی خاطر اسرار و حکم کو گوناگوں پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ اس کے لیے قرآن میں "تصریف" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب گردش کرنا ہے۔ جب ایک طالبِ علم قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اسے ایک ہی مضمون تکرار کے ساتھ مختلف سورتوں میں نظر آتا ہے۔ لیکن جب وہ اس پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن تکرارِ محض سے بالکل پاک ہے۔ اس میں ایک ہی مضمون کو تکرار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تو وہ بعینہٖ ایک ہی پیش وعقب اور ایک ہی قسم کے لواحق وتضمنات کے ساتھ نہیں بلکہ ہر جگہ اس کے اطراف وجوانب اور اس کے تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہیں۔ مقامِ مناسبت سے اس میں تبدیلیاں موجود ہیں۔ ایک مقام پر جو پہلو مخفی ہوتا ہے، دوسرے مقام پر واضح ہو جاتا ہے۔ ایک مقام پر اس کا رُخ غیر معین ہوتا ہے، دوسرے مقام پر واضح ہو جاتا ہے۔ ایک لفظ ایک آیت میں بالکل مبہم نظر آتا ہے، دوسری آیت میں وہ لفظ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ایک بات کی دلیل سمجھ میں نہیں آتی، لیکن اسی بات کو دوسری جگہ تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ابن تیمیہؒ کے اس اصول کی صداقت خود قرآن سے معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس کا اعلان ہے:

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (ھود: ۱)

"الر، فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں، ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے۔"

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (حم السجدۃ: ۳)

"ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔"

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (الاعراف: ۵۲)

"ہم ان لوگوں کے پاس ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر مفصل بنایا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔"

۲- علامہ کے نزدیک فہمِ قرآن کا دوسرا اصول یہ ہے کہ سنتِ نبویؐ اور احادیثِ نبویؐ کی مدد سے قرآن کا فہم کیا جائے، کیوں کہ

قرآن حکیم نقشۂ تعمیر ہے اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مطابق تیار کی ہوئی عمارت ہے۔ نقشے کے ساتھ انجینئر بھیجنے کے اصول پر اس وقت سے عمل درآمد ہو رہا ہے جب سے ہدایتِ الٰہی کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس بنا پر حالات و زمانہ کے تقاضوں کی مناسبت سے عمارت کی تعمیر انجینئر کی بنائی ہوئی عمارت کو قطعاً نظر انداز کر کے اصل نقشے کے مطابق نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کو قرآن کا شارح قرار دیا ہے:

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ۔ (النحل: ۴۴)

''اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے۔''

یٰۤاَیُّہَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ (المائدۃ: ۶۷)

''اے پیغمبر! جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔''

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىکَ اللّٰہُ وَ لَا تَکُنۡ لِّلۡخَآئِنِیۡنَ خَصِیۡمًا۔ (النساء: ۱۰۵)

''اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہِ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔''

وَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَہُمُ الَّذِی اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ ۙ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ۔ (النحل: ۶۴)

''ہم نے یہ کتاب تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ تم ان اختلافات کی حقیقت ان پر کھول دو جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب رہنمائی اور رحمت بن کر اتری ہے ان لوگوں کے لیے جو اسے مان لیں۔''

اسی وجہ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَه (ابو داود: ۴۶۰۴)

''معلوم ہے مجھے قرآن بھی بخشا گیا ہے اور قرآن کے ساتھ اس کا مثل بھی۔''

اور یہ مثیل قرآن، سنت ہے۔ مندرجہ بالا آیت کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ جو چیزیں قرآن میں نہ مل سکیں ان کو سنت میں تلاش کرو۔ جیسا کہ حضرت معاذؓ سے یمن روانہ کرتے وقت اللہ کے رسولؐ نے سوال فرمایا تھا: کس چیز سے فیصلہ کرو گے؟ معاذؓ نے فرمایا: کتاب اللہ سے۔ فرمایا: اگر اس میں نہ ملے؟ معاذؓ نے عرض کیا: سنتِ رسولؐ سے۔ فرمایا: اگر سنت میں بھی نہ پایا؟ عرض کیا: اس صورت میں اپنے اجتہادِ رائے سے کام لوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر معاذؓ کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: خدا کا شکر ہے جس نے رسول اللہؐ کے قاصد کو وہ توفیق بخشی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا طرزِ عمل منقول ہے کہ آپ کے سامنے کوئی قانونی معاملہ آتا تو پہلے قرآن کریم میں اس کا حل تلاش کرتے۔ اگر وہاں نہ ملتا تو سنت کی طرف رجوع کرتے۔ اگر سنت میں بھی نہ ملتا تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ اس معاملے میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کا کسی کو علم ہے؟ بسا اوقات صحابہؓ میں سے کچھ لوگ بتا دیتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں یہ فیصلہ فرمایا ہے تو صدیق اکبرؓ سنت کی سند ملنے پر خوش ہو کر فرماتے تھے کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایسے لوگوں کو باقی رکھا جن میں ہمارے نبیؐ کی سنتیں محفوظ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے قرآن فہمی کے سلسلے میں سنت کی تشریحات کو بنیاد بناتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا: ''آئندہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآنی مشتبہات میں تم سے جھگڑیں گے۔ ایسی صورت میں سنتوں کے ذریعے ان پر حجت قائم کرنا، کیوں کہ اصحابِ سنن، کتاب اللہ کو خوب جانتے تھے۔'' ائمۂ قانون نے بھی قرآن فہمی اور قانون کے مرحلے میں سنت کو خاص اہمیت دی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے ''اگر سنتیں نہ ہوتیں تو ہم میں سے کوئی شخص قرآن کا فہم حاصل نہ کر سکتا تھا۔'' مزید وضاحت اس قول سے ہوتی ہے کہ ''لوگ اس وقت تک خیر وصلاح میں رہیں گے جب تک ان میں حدیث کے طالب موجود ہوں گے اور جب وہ بغیر حدیث کے علم حاصل کریں گے تو بگاڑ اور فساد میں مبتلا ہو جائیں گے۔'' امام شافعیؒ نے تو وضاحت سے کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم بھی دیا وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔

> **شیخ الاسلام کے نزدیک فہمِ قرآن کے اصول:**
> (۳) اگر کوئی چیز قرآن وسنت سے سمجھ میں نہ آسکے تو اس کو اقوالِ صحابہؓ سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
> (۴) اسرائیلی روایات سے اجتناب کیا جائے۔

۳- امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک فہمِ قرآن کا تیسرا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی چیز قرآن وسنت سے سمجھ میں نہ آسکے تو اس کو اقوالِ صحابہؓ سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ قرائن وحالات کے مشاہدے کی وجہ سے وہ مطالبِ قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے اور مکمل فہم اور عمل صالح کے مالک تھے۔ امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبریؒ نے بھی اپنے اسناد سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ''قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ کتاب اللہ کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ کس کے حق میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ اگر میں کسی ایسے شخص کو جانتا جو مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھتا ہے اور اس کے پاس سواری سے پہنچا جا سکتا تو میں ضرور اس کے پاس جا پہنچتا۔'' سلیمان بن مہران الاعمش کوفیؒ نے اپنے اسناد سے عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ''ہم میں سے کوئی دس آیتوں سے زیادہ اس وقت تک نہیں پڑھتا تھا جب تک کہ ان آیتوں کے معانی کی معرفت نہ حاصل کر لے اور ان پر عمل میں بھی پختہ نہ ہو جائے۔''

۴- علامہ نے فہمِ قرآن کا چوتھا اصول یہ بتایا ہے کہ اسرائیلی روایات سے اجتناب کیا جائے۔ علامہ کے نزدیک اسرائیلی روایات استشہاد کے لیے تو استعمال کی جا سکتی ہیں، لیکن اعتقاد کے لیے نہیں روایت کی جا سکتیں۔ اسرائیلیات تین طرح کی ہو سکتی ہیں۔ پہلی قسم کی اسرائیلیات تو وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن خاموش ہے، نہ قرآن نے اس کی تصدیق کی ہے اور نہ تکذیب۔ تو

ایسی اسرائیلیات پر شیخ الاسلام نہ ایمان رکھتے ہیں اور نہ انکار کرتے ہیں۔اس طرح کی روایات زیادہ سے زیادہ استشہاد کے لیے جائز ہوسکتی ہیں۔دوسری قسم کی اسرائیلیات وہ ہیں جن کی صحت پر قرآن کی آیات دلیل ہیں۔لیکن تیسری قسم کی وہ جھوٹی اسرائیلیات ہیں جن کے بارے میں قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ یہ روایات غلط ہیں۔ایسی روایات کو شیخ الاسلام نے باطل قرار دیا ہے۔لیکن زیادہ تر اسرائیلیات کے بارے میں خود علمائے اہلِ کتاب کے اندر زبردست اختلاف ہے۔اس لیے ان روایات سے دین میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔اسرائیلیات کے سلسلے میں علمائے اہلِ کتاب کے اندر اختلاف کی وجہ سے مفسرین قرآن نے اصحابِ کہف، ان کے کتے کا رنگ اور ان کی تعداد میں اختلاف کیا ہے۔اللہ نے ان امور کو قرآن میں مبہم رکھا ہے اور ان کے علم سے بھی دین و دنیا میں کسی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔مگر اس کے بارے میں اہلِ کتاب کا اختلاف نقل کرنا جائز ہے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس اختلاف کا ذکر فرمایا ہے۔

> **شیخ الاسلام کے نزدیک فہمِ قرآن کے اصول:**
> (۵) تابعین کے اقوال سے استدلال ہے۔
> (۶) محض رائے سے من گھڑت تفسیر کرنا حرام ہے۔

۵-علامہ کے نزدیک فہمِ قرآن کا پانچواں اصول تابعین کے اقوال سے استدلال ہے۔جب کوئی چیز قرآن میں نہ ملے اور اس کے بعد سنت میں نہ ملے اور نہ اقوالِ صحابہؓ میں تو ایسی صورت میں اقوالِ تابعین کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔مثلاً مجاہد بن جبیر، سعید بن جبیر، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ، عطا بن ابی رباح، حسن بصری، سعید بن المسیب وغیرہ وہ تابعی علما ہیں جو محدثین و مفسرین کے نزدیک معتبر اور ثقہ ہیں۔مجاہدؒ علمِ تفسیر میں خدا کی نشانی تھے۔محمد بن اسحاق نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ مجاہدؒ کہتے تھے کہ میں نے مصحفِ قرآنی تین مرتبہ شروع سے آخر تک عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے پیش کیا۔ہر آیت پر ان کو ٹھہراتا اور تفسیر پوچھتا تھا۔ترمذیؒ نے اپنی سند سے مجاہدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: ”قرآن میں کوئی آیت نہیں جس کی تفسیر میں کچھ نہ کچھ میں نے نہ سنا ہو۔“ ترمذی ہی کی روایت ہے مجاہدؒ نے کہا کہ اگر میں نے عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت لی ہوتی تو قرآن کے بارے میں عبداللہ بن عباسؓ سے کچھ پوچھنے کی نوبت پیش نہ آتی۔ابن جریرؒ نے ابن ابی ملیکہؒ سے روایت کیا ہے کہ میں نے مجاہدؒ کو دیکھا کہ اپنے کاغذ قلم لیے ابن عباسؓ کے پاس پہنچے اور تفسیر قرآن کے بارے میں سوال کرنا شروع کیے۔ابن عباسؓ نے فرمایا: لکھتے جاؤ۔اس طرح مجاہد نے پوری تفسیر پوچھ لی۔اس لیے سفیان ثوریؒ کہا کرتے تھے کہ جب مجاہدؒ سے تفسیر ملے تو یہ تمھارے لیے کافی ہے۔لیکن جب تابعین کے اقوال میں اختلاف ہو جائے تو اس صورت میں اس سے استدلال لازم نہیں ہے۔ایسی صورت میں قرآن و سنت کی زبان کو، عام لغتِ عرب کو یا اقوالِ صحابہؓ کو مدنظر رکھنا چاہیے۔لیکن جب تابعین کا کسی آیت کے بارے میں اجماع ہو جائے تو وہ تمام لوگوں کے لیے حجت ہے۔اس سے استدلال لازم ہے۔

۶۔فہمِ قرآن کے سلسلے میں علامہ کا چھٹا اصول یہ ہے کہ محض رائے سے من گھڑت تفسیر کرنا حرام ہے۔ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ''جو شخص بغیر علم کے قرآن میں گفتگو کرتا ہے، اپنے لیے دوزخ میں ٹھکانا بناتا ہے۔''سنن ترمذی میں حضرت جندبؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی قرآن میں اپنی رائے سے کہے اور اس کا کہنا صحیح ہو تو بھی وہ غلطی کا مرتکب ہے۔ترمذی نے اس حدیث کو غریب بتلایا ہے اور بعض علمائے حدیث نے اس کے راوی سہیل بن ابی حزم کے ثقہ ہونے میں کلام کیا ہے۔رسول اللہؐ کی انہی حدیثوں کی وجہ سے اہلِ علم کا کہنا ہے کہ رسول اللہؐ کے ساتھی اور آپ ﷺ کے بعد کے

> دعوتِ دین اور اشاعتِ اسلام کی راہ میں ہونے والی ہر جدوجہد کا راستہ فہمِ قرآن سے گزرتا ہے۔انیسویں اور بیسویں صدی کی تمام عالمی اسلامی تحریکات نے توحید و مساوات کے عالمگیر اسلامی اصول کی طرف رجوع کا جو پیغام دیا ہے اس میں انھوں نے قرآن کریم سے براہِ راست استفادہ پر سب سے زیادہ زور دیا۔

سلفِ صالحین، بغیر علم کے قرآن کی کسی آیت کی تفسیر ہرگز نہ کرتے تھے۔جو شخص بغیر علم کے قرآن کی تفسیر کرتا ہے اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو جہل کی حالت میں لوگوں کے فیصلے کرنے بیٹھ جائے اور غلط فیصلے کر کے جہنم کا ایندھن بن جائے۔صحابہ کرامؓ اور سلفِ صالحین ایسی تفسیر سے گریز کرتے تھے جن کے بارے میں ان کو علم نہ ہو۔حضرت شعبہؒ کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اگر کتاب اللہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں؟ امام عبد بن حمید نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ ہم حضرت عمرؓ کے پاس موجود تھے۔ہم نے دیکھا کہ ان کے کرتے کی پیٹھ پر چار پیوند لگے ہوئے ہیں۔پھر انھوں نے پڑھا 'فاکھۃً واباً' پھر کہنے لگے کہ یہ ''ابّ'' کیا ہے؟ پھر خود ہی کہا 'اسی کو تکلف کہتے ہیں' تو اگر نہیں جانتا تو حرج بھی کیا ہے۔امام ابوعبید نے ابن ابی ملیکہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ابن عباسؓ سے سوال کیا کہ اس ارشادِ قرآنی میں دن سے کیا مراد ہے:

یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ (السجدۃ:۵)

تو حضرت ابن عباسؓ نے اس شخص سے الٹے سوال کیا: 'اور یہ دن کون سا ہے یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (المعارج:۴)؟ اس پر وہ شخص کہنے لگا: میں یہ پوچھ رہا ہوں تا کہ آپ مجھے بتائیں۔ابن عباسؓ نے جواب دیا: یہ دو دن ہیں جن کا ذکر خدا نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور خدا ہی ان دنوں کی حقیقت بہتر جانتا ہے۔یہ اور اس طرح کے بہت سے آثارِ صحیحہ کا مطلب یہ


مزار ابن تیمیہ

ہے کہ سلفِ صالحین بغیر علم کے تفسیر میں دخل نہیں دیتے تھے۔لیکن شیخ الاسلام کے نزدیک جس شخص کو لغت وشرع کے اعتبار سے علم حاصل ہو، اس کے لیے تفسیر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیوں کہ جس طرح سے بے علمی کی وجہ سے سکوت واجب ہے، اسی طرح سے علم ہونے کی صورت میں جواب بھی دینا واجب ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ (آل عمران :۱۸۷)۔اس آیتِ کریمہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس شخص کے پاس قرآن کا علم ہو وہ اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرے۔ آیات کی وضاحت اور ان کی تفسیر کو چھپانے کی صورت میں وہ کتمانِ علم کے مجرمین کی فہرست میں آتا ہے۔ان کے بارے میں اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص سے علم کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے اور وہ علم کو چھپاتا ہے، قیامت کے دن اس کے منہ میں آتشی لگام دی جائے''۔یعنی جس آیت کی تفسیر نہ معلوم ہو اس کی تفسیر ہرگز نہ بیان کرنی چاہیے، کیوں کہ ایسا شخص بھی جہنم کا مستحق ہوگا۔



دعوتِ دین اور اشاعتِ اسلام کی راہ میں ہونے والی ہر جدوجہد کا راستہ فہمِ قرآن سے گزرتا ہے۔انیسویں اور بیسویں صدی کی تمام عالمی اسلامی تحریکات نے توحید ومساوات کے عالمگیر اسلامی اصول کی طرف رجوع کا جو پیغام دیا ہے اس میں انھوں نے قرآن کریم سے براہِ راست استفادہ پر سب سے زیادہ زور دیا۔علامہ محمد ابن عبدالوہابؒ، سید احمد شہیدؒ، حاجی شریعت اللہؒ، شیخ محمد بن علی السنوسیؒ، عثمان وان فوڈیوؒ سے لے کر امام حسن البنا، سید قطب شہیدؒ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تک تمام مفکرین اسلام و بانیانِ تحریکاتِ اسلام نے اپنی اپنی تحریروں میں افہام وتفہیمِ قرآن پر بطورِ خاص توجہ صرف کی۔ آج کارکنانِ تحریک کو فہمِ قرآن کے ان اصولوں کے مطابق قرآن کریم سے براہِ راست رابطہ استوار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انقلابِ اسلامی کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

. . .

خوش خبری

سہ ماہی کتاب وسنت، دہلی

امام المفسرین حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

کی لاثانی شخصیت اور لافانی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے

جلد ہی منظر عام پر لا رہا ہے **امام المفسرین** نمبر۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی کی ایک اہم تصنیف تفسیر عزیزی: ایک مطالعہ

ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی
(ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ)

علوم اسلامی کے فروغ اور اشاعت میں خاندان ولی اللہی کی خدمات آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اس پورے خاندان نے حدیث، تفسیر، تاریخ اور تصوف کے میدان میں گراں مایہ خدمات انجام دیں ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے معاشرتی اصلاح کے لیے بھی زبردست کارنامے انجام دیے۔ ہندستان کی جنگ آزادی میں بھی ان کا اہم کردار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خاندان کے دینی، علمی اور اصلاحی کام بڑی بڑی حکومتوں کی خدمات سے بڑھ کر ہیں۔

قرآنیات کی خدمات کے حوالے سے دیکھا جائے تو حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے تین بیٹوں نے قرآن مجید کے چار ترجمے کیے، چار تفسیریں لکھیں، دو فارسی میں اور دو اردو میں:

۱۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
۲۔ شاہ عبدالقادر
۳۔ شاہ رفیع الدین
۴۔ شاہ عبدالعزیز

> حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کو قرآن فہمی کا خاص ذوق تھا اور اشاعت قرآن کی بھی ان کے اندر بڑی لگن تھی۔ انھوں نے عمر بھر اشاعت قرآن کے لیے جدوجہد کی۔

چاروں ترجموں اور تفسیروں کا مقصد یہی تھا کہ عوام کے درمیان مطالعہ قرآن کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس لیے ان کے عہد میں استعمال ہونے والی پیچیدہ زبان کے برخلاف انھوں نے بہت آسان اور سادہ زبان میں یہ ترجمے اور تفسیر لکھی۔ شاہ ولی اللہ نے ترجمہ وتفسیر کے علاوہ بھی قرآنیات کے موضوع پر کئی اہم کام کیے۔ مثلاً انھوں نے اصول تفسیر پر ایک کتاب 'الفوز الکبیر' کے نام سے لکھی جو اپنے موضوع پر پوری اسلامی تاریخ کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ اسی طرح انھوں نے ہی فن ترجمہ نگاری میں مقدمہ در قوانین ترجمہ کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی جو اپنے موضوع پر غالباً تاریخ انسانی کی پہلی کتاب ہے۔ ان کاموں کے علاوہ قرآن کے فہم کو عام کرنے کے لیے اور بھی متعدد کام کیے۔ ان غیر معمولی کاموں اور خدمات کا اثر ہے کہ نہ صرف برصغیر میں مطالعہ قرآن کی طرح کا آغاز ہوا بلکہ پوری دنیا میں قرآن فہمی کی ایک لہر سی پیدا ہو گئی۔

قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کی اشاعت کے لیے شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶-۱۸۲۳) کی خدمات بھی بہت اہم ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور فارسی میں ہی تفسیر بھی لکھی۔ ان کی تفسیر کا اصل نام تو فتح العزیز ہے لیکن عام

طور پر وہ تفسیر عزیزی کے نام سے معروف ہے۔ یہ تفسیر ان کا اہم کارنامہ ہے۔ تاہم اس تفسیر کے علاوہ بھی انھوں نے کئی طرح سے قرآن مجید کے معانی ومفاہیم کی نشر واشاعت میں حصہ لیا۔

شاہ عبدالعزیز بڑے عالم و فاضل تھے۔ تمام دینی علوم میں ان کو غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ عربی و فارسی میں اعلیٰ درجہ کی مہارت کے ساتھ ساتھ عبرانی زبان میں بھی ان کو مہارت حاصل تھی اور انھوں نے توراۃ وزبور کا مطالعہ عبرانی میں کیا تھا۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اظہارِ بیان کی بھی غیر معمولی صلاحیت ان کے اندر تھی۔ وہ اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مختلف قسم کے مناظروں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ مناظروں کے علاوہ اپنی خطیبانہ صلاحیتوں کا استعمال انھوں نے درس قرآن کے لیے بھی کیا۔ وہ ساری عمر باضابطہ درس قرآن دیتے رہے۔ انھوں نے اپنی عمر کی تقریباً ۸۰ دہائیاں دیکھیں اور اپنی وفات سے چند دن قبل تک درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھا۔

شاہ عبدالعزیز نے تصنیفی کام تو کم کیا ہے، تقریباً دس کتابیں اور کچھ رسائل انھوں نے لکھے ہیں لیکن ان کا ذوق اور اسلوب نگارش تحقیقی اور تجزیاتی تھا اس لیے ان کے اکثر کام پائیدار اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی تصنیفات میں نہایت گہرائی کے ساتھ مسائل کو سمجھا اور سلجھایا گیا ہے۔ حدیث اور اصول حدیث میں ان کی کتاب بستان المحدثین اور عجالہ نافعہ ہیں جو آج بھی اپنے موضوع پر مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شیعہ سنی اختلاف پر ان کی ایک مفصل کتاب تحفہ اثنا عشریہ ہے۔ یہ بھی اپنے موضوع کی معرکہ آرا کتاب ہے۔ اس کتاب کے علاوہ اور بھی مختلف علمی موضوعات پر انھوں نے متعدد رسالے تصنیف کیے جن میں سے کئی مطبوعہ شکل میں دستیاب ہیں۔ ان تصنیفی کاموں کے علاوہ ان کا ایک اہم تصنیفی کام ان کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا فتح العزیز کے نام سے لکھی گئی۔ اس تفسیر کے علاوہ قرآنیات پر ان کی اور بھی خدمات ہیں۔ ذیل کے صفحات میں ان کی مجموعی قرآنی خدمات کا تعارف پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہ عبدالعزیز کی قرآنی خدمات

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کو قرآن فہمی کا خاص ذوق تھا اور اشاعت قرآن کی بھی ان کے اندر بڑی لگن تھی۔ انھوں نے عمر بھر اشاعت قرآن کے لیے جدوجہد کی۔ ان کی قرآنی خدمات کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ کئی طرح کی ہیں تاہم ان کو درج ذیل حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

ا۔ درس قرآن
ب۔ فتاوی عزیزیہ میں قرآنی مباحث
ج۔ افادات عزیزیہ
د۔ تفسیر عزیزی المعروف بہ وعظ عزیزی

> مولانا عبدالحی لکھنوی نے حضرت کے درس قرآن کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا درس قرآن کا سلسلہ ان کی وفات سے چند یوم قبل تک جاری رہا اور انھوں نے آخری درس قرآن إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ کا دیا تھا۔

ہ۔تفسیر فتح العزیز یا تفسیر عزیزی

ذیل کے صفحات میں ان کی ان تمام قرآنی خدمات کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ا۔درس قرآن

حضرت شاہ عبدالعزیز نے درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا جو تمام عمر قائم رہا۔ان کا درس بہت مقبول تھا۔درس قرآن کی یہ روایت ان کی خاندانی روایت تھی۔اس خاندان کا ایک مقصد حیات ہی قرآن کی ترویج و اشاعت تھا۔اگر چہ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ انھوں نے درس قرآن کے اس سلسلے کا آغاز کب کیا تھا لیکن قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ کام انھوں نے جوانی میں ہی شروع کر دیا تھا۔اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس خاندان میں درس قرآن کی روایت پہلے سے چلی آرہی تھی۔دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ اپنے بارے میں فرمایا کہ کسی شاعر نے مجھے یہ قطعہ سنایا:

جامع علم وعمل شیخ اوری عبد العزیز
آنکہ او اندر جوانی کار پیران می کنند
بسکہ استمداد دارد از سحاب معنوی
بحر مواج است چون تفسیر قرآن می گند(۱)

(علم وعمل کے جامع شاہ عبدالعزیز وہ ہستی ہیں جو جوانی میں بھی بزرگوں والے کام انجام دیتے ہیں۔چوں کہ وہ سحاب معنوی سے استمداد کرتے ہیں اس لیے تفسیر قرآن کرتے وقت ٹھاٹھیں مارنے والا سمندر معلوم ہوتے ہیں۔)

حضرت شاہ صاحب نے اس شاعر کا نام تو نہیں بتایا لیکن اس قطعے میں ایک ایسا اشارہ ضرور ملتا ہے، جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی جوانی کے زمانے سے ہی درس قرآن دیا کرتے تھے۔یہ بات معلوم ہے کہ انھوں نے تفسیر لکھنے کا آغاز ۴۹ رسال کی عمر میں کیا تھا۔گویا جب انھوں نے تفسیر لکھنے کا آغاز کیا تو اس وقت تک اس کی تفسیر دانی کافی معروف ہو چکی تھی۔مذکورہ بالا قطعہ کی روشنی میں مولانا نسیم احمد فریدی نے لکھا ہے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے جوانی میں تفسیر لکھی تھی۔اس پر پروفیسر عضد الدین خاں نے تنقید بھی کی ہے کہ یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ انھوں نے ۴۹ رسال کی عمر میں تفسیر لکھی تھی اور یہ عمر جوانی کی نہیں ہوتی، تاہم اس قطعہ سے یہ بات تو ثابت ہو ہی جاتی ہے کہ انھوں نے جوانی میں ہی درس قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کا درس قرآن روزانہ نہیں ہوتا تھا۔وہ ہفتے میں صرف دو دن جمعہ اور منگل کے روز ہی درس قرآن دیا کرتے تھے۔ان کے درس قرآن کی کیفیت ان کے ایک شاگرد اور مشہور عالم اور مناظر مولانا حیدر علی فیض آبادی نے اس طرح لکھی ہے:

''علامہ دہلوی (حضرت شاہ عبدالعزیز) روز جمعہ اور سہ شنبہ (منگل) کو مجلس وعظ اپنے مدرسے میں منعقد کرتے تھے۔مشتاقین

وہاں جمع ہوتے تھے اور یہ وعظ کافی دیر تک ہوتا تھا۔علماء کرام تفسیر بیضاوی،تفسیر نیشاپوری،کشاف اور دیگر تفاسیر مشکلہ اپنے سامنے رکھتے تھے اور سمجھ لیتے تھے کہ اس وقت فلاں اشکال کو فلاں تفسیر میں سے حل فرمایا گیا ہے۔میں نے بارہا یہ دیکھا کہ جس شخص کے دل میں کسی قسم کا اعتراض یا شبہ آتا تھا آپ کی تقریر سے وہ شخص مطمئن ہو جاتا تھا۔آپ کے فیض صحبت سے اکثر غیر مسلم مسلمان ہو جاتے اور شک وتردد والے قوت اعتقاد حاصل کرتے تھے۔فقیر کا سفر دہلی محض تحقیق مذہب کے سلسلے میں ہوا تھا جب اس بابرکت صحبت میں التزام کے ساتھ رہا تو تمام شکوک واوہام ختم ہو گئے۔(۲)

مولانا حیدر علی خود ان دروس میں شریک رہے اس لیے ان کی بات استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ان کے ایک اور شاگرد ابوالفرید امام الدین نے بھی شاہ صاحب کے دروس نقل کیے تھے اور ان دروس کا ایک حصہ شائع بھی کیا تھا جس کا تذکرہ ہو چکا۔انھوں نے بھی شاہ صاحب کے درس قرآن کی یہی کیفیات لکھی ہیں کہ وہ جمعہ اور سہ شنبہ کو درس دیا کرتے تھے۔(۳)

مولانا عبدالحی لکھنوی نے حضرت کے درس قرآن کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا درس قرآن کا سلسلہ ان کی وفات سے چند یوم قبل تک جاری رہا اور انھوں نے آخری درس قرآن إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ کا دیا تھا۔(۴)

حضرت شاہ صاحب کے بہت سے تلامذہ نے بھی قرآنی خدمات انجام دی ہیں۔قاضی ثناءاللہ پانی پتی نے بھی تفسیر مظہری لکھی ہے ان پر یقینا ان دروس کے اثرات رہے۔تاہم ان کو الگ سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ب۔فتاوی عزیزیہ میں قرآنی مباحث

فتاوی عزیزیہ حضرت شاہ صاحب کی بہت اہم تصنیف ہے۔اس کتاب میں انھوں نے قرآن کریم کی بہت سی آیات کی تفسیر کی ہے۔کہیں کسی مسئلے کی وضاحت کے حوالے سے اور کہیں کسی کے استفسار پر۔حاجی محمد زکی کے زیر اہتمام فتاوی عزیزیہ کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔اس میں ایک اہتمام یہ بھی کیا ہے کہ تمام فتاوی کو ابواب کی ترتیب کے ساتھ مرتب کر دیا ہے اس کی وجہ سے ان سے استفادہ آسان ہو گیا۔اس اشاعت میں صفحہ ۱۵ر سے ۵۰ر تک باب التفسیر والتشریح ہے۔اس باب میں فتاوی کے اندر مذکور تفسیری مباحث کو یکجا کر دیا ہے۔تاہم ان فتاوی کا ایک نسخہ مطبع مجتبائی سے بھی شائع ہوا تھا۔وہ نسخہ فارسی میں ہے اور اس میں بھی قرآنیات کا مستقل باب ہے۔فتاوی کا یہ حصہ بھی ان کی قرآنی خدمات کا حصہ ہے۔اس میں ایک ایک یا دو دو آیتوں کی تفسیر ایک ساتھ ہے۔اس حصے میں عام اسلوب سوال وجواب کا ہے یعنی کسی آیت سے متعلق کوئی سوال آیا اس کا جواب لکھ دیا۔اس حصے میں بہت سی آیات کی تفسیر تفسیر عزیزی کے مسودات سے نقل کی گئی ہے۔جگہ جگہ اس کا بھی حوالہ ہے۔ان جوابات میں بھی تفسیر قرآن اور تمام علوم اسلامیہ کے بڑے منفرد نکات بیان ہو گئے ہیں۔

ج۔افادات عزیزیہ

حضرت شاہ عبدالعزیز کی ایک کتاب افادات عزیزیہ کے نام سے بھی ملتی ہے۔مولانا نسیم احمد فریدی نے اس کتاب کا نام اسئلہ

واجو بہ لکھا ہے۔اس پر پروفیسر عضدالدین خاں نے تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ ندوہ میں اس کے دو مخطوطات ہیں اور ان پر افادات عزیزیہ ہی لکھا ہے۔(۵)

ویسے علی گڑھ کے کتب خانے میں جو نسخہ ہے اس کا نام اسئلہ واجو بہ ہی ہے۔اس لیے اس کا امکان ہے کہ یہ دو الگ الگ کتابیں ہوں اور اسلوب نگارش ایک جیسا ہونے کی وجہ سے محققین کو التباس ہو گیا ہو۔

افادات عزیزیہ دراصل اپنے دور میں فاصلاتی تعلیم کی ایک مثال ہے۔یہ کتاب بنیادی طور پر خطوط کا مجموعہ ہے۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ایک شاگرد حاجی رفیع الدین فاروقی مرادآبادی بذریعہ خط حضرت عبدالعزیز کی خدمت میں قرآن مجید سے متعلق اپنے سوالات بھیجتے تھے،حضرت ان کے جواب دیتے۔اس طرح خطوط کے ذریعے انھوں نے حضرت شاہ صاحب سے تفسیر پڑھی۔ ان خطوط اور نکات کو بعد میں انھوں نے کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔حضرت شاہ رفیع الدین فاروقی نے اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔اس میں اس پوری کیفیت کو خود بھی بیان فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ عبدالعزیز سلمہ اللہ تعالی نے ایک تفسیر تالیف کی ہے جس کا نام فتح العزیز ہے۔ابھی اس کے مسودات بیاض کی منزل تک نہیں پہونچے ہیں۔یوں تو اس میں تحقیقات بسیار اور لطائف بے شمار تحریر ہوئے ہیں۔مگر پانچ علوم پر خصوصیت سے بحث کی گئی ہے۔

۱۔سورتوں کے عنوانات اور اجمالاً ہر سورت کا مضمون۔
۲۔بعض آیات کا بعض کے ساتھ ربط۔
۳۔متشابہات القرآن۔
۴۔قصص واحکام قرآنی کے اسرار۔
۵۔لطائف نظم قرآن۔

مصنف سلمہ اللہ تعالی نے ان پانچوں علوم کے نمونے جستہ جستہ فقیر محمد رفیع الدین مرادآبادی کو مکاتیب کی شکل میں روانہ فرمائے۔ان کے بارے میں احقر نے جو سوالات کیے اُن کے جوابات بھی مکاتیب میں لکھے۔میں نے ان سب کو ان اوراق میں جمع کر دیا۔واللہ ولی التوفیق''(۶)

> ''مولانا انور شاہ کشمیری فرمایا کرتے تھے کہ اگر تفسیر عزیزی مکمل ہو جاتی تو پوری امت کی طرف سے قرآن کا ایک حق ادا ہو جاتا۔''

چوں کہ یہ تمام سوالات قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق تھے اس لیے اس کتاب کو بھی قرآنی خدمات کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔اس کتاب کے کئی قلمی نسخے دستیاب ہیں۔مولانا نسیم احمد فریدی نے اس کے چار مخطوطات کا ذکر کیا ہے ایک دارالعلوم ندوۃ العلما میں ایک علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ایک مظاہر العلوم میں اور ایک نسخہ رام پور کے شہر قاضی کے کتب خانے میں۔(۷)

شاہ عبدالعزیز کی یہ کتاب ابھی تک غالبا اشاعت کی منتظر ہے،اگر یہ کتاب شائع ہو جائے تو اس سے شاہ عبدالعزیز کی قرآنی

خدمات کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔اس کتاب کے مرتب کا انداز بیان یہ بتا رہا ہے کہ یہ حضرت شاہ صاحب کی قرآنی فکر کا خلاصہ ہوگی۔

د۔تفسیر عزیزی المعروف بہ وعظ عزیزی

تفسیر عزیزی المعروف بہ وعظ عزیزی شاہ عبدالعزیز کے دروس قرآنی پر مشتمل ایک کتاب ہے، یہ ان کے ایک شاگرد ابوالفرید امام الدین (۸) نے لکھی ہے۔دراصل ابوالفرید امام الدین نے دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیزی کے دروس میں شرکت کی اور ان میں سے کچھ دروس نقل کیے۔بعد میں ان دروس کو کتابی شکل میں شائع کر دیا۔اس سلسلے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

> ''وارثین انبیا کے ان سردار کا قدیم زمانے سے یہ معمول تھا کہ سہ شنبہ (منگل) اور جمعہ کے روز درس قرآن وحدیث دیا کرتے تھے۔آیات اور سورتوں کے رابطے کو ہزاروں نکات کے ساتھ ایسے بیان فرماتے تھے کہ ہر شخص کی سمجھ میں آجائے۔۔۔میں ان کی اس دل پذیر تقریر کو لکھنے کا ارادہ کیا اور سورہ مومنون سے سورہ الصافات تک ان کی تقریر قلم بند کی۔''(۹)

ابوالفرید امام الدین نے اس طرح یہ کتاب مرتب کر کے شائع کی۔اس مطبوعہ نسخے میں ۲۵۹ صفحات ہیں اور یہ نسخہ دہلی میں مطبع انصاری سے شائع ہوا، سنہ اشاعت مذکور نہیں ہے۔اس نسخے میں سورہ المومنون سے سورہ یسین تک کی تفسیر ہے۔(۱۰)

پروفیسر عضدالدین خاں نے اس نسخے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اس کتاب کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ شاہ صاحب کے درس قرآن میں لیے گئے نوٹ ہیں، جنھیں امام الدین صاحب نے دوران درس قلم بند کیا ہے۔اسی وجہ سے مفصل نہیں ہیں۔مگر انداز بالکل وہی ہے جو تفسیر فتح العزیز کا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ فتح العزیز مفصل ہے اور مستقل تصنیف ہے اور وعظ عزیزی ان کے درس کا خلاصہ ہے۔''(۱۱)

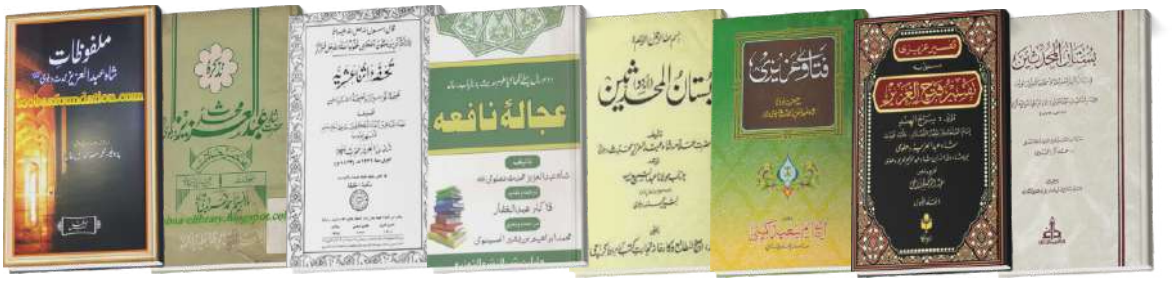
ہ۔فتح العزیز یا تفسیر عزیزی

قرآنی خدمات میں حضرت شاہ عبدالعزیز کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تفسیر عزیزی ہے۔انھوں نے تفسیر فتح العزیز یا تفسیر عزیزی کے نام سے قرآن مجید کی یہ تفسیر لکھی۔یہ تفسیر قرآن مجید کے سوا تین پاروں کی تفسیر ہے۔دو پارے آخر کے اور سوا پارہ شروع کا۔یہ حصہ مطبوعہ ہے اور عوام وخواص میں کافی مقبول ہے۔اس تفسیر کے سلسلے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت شاہ صاحب نے اتنی ہی تفسیر لکھی تھی یا اس سے زیادہ لکھی تھی۔ایک سوال یہ بھی ہے کہ اس تفسیر کے لکھنے کی کیفیت کیا تھی۔ذیل میں مختلف عناوین کے تحت اس تفسیر کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس سلسلہ میں درج ذیل چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

فتح العزیز یا تفسیر عزیزی کی تاریخ

دستیاب تفسیر میں حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک مختصر مقدمہ لکھا ہے۔اس میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ انھوں نے شیخ

مصدق الدین عبداللہ کے کہنے پر یہ تفسیر لکھی تھی، بلکہ یہ تفسیر شاہ صاحب نے اس وقت لکھی تھی جب ان کی بینائی جا چکی تھی اس لیے حضرت نے اپنے قلم سے نہیں لکھی تھی، مصدق الدین کو املا کروائی تھی۔ اس تفسیر کے مقدمے میں مزید لکھا ہے کہ اس تفسیر کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان جن سورتوں اور آیات کو پنج وقتہ نمازوں میں پڑھتے ہیں یا پھر ایصال ثواب کے لیے پڑھتے ہیں ان حصوں کا ترجمہ و تفسیر لکھا جائے تا کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت نے آخری دو پارے اور شروع کے ڈھائی پاروں کی تفسیر لکھی۔ شروع کے ڈھائی پارے یعنی سورہ بقرہ کی تفسیر لکھی۔ حضرت نے سورہ بقرہ کی تلاوت سے اپنے والہانہ شغف کا بھی اس مقدمے میں ذکر کیا ہے۔ اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ حضرت نے سورہ بقرہ کی مکمل تفسیر لکھی تھی لیکن اب شروع کے صرف سوا پارے کی تفسیر دستیاب ہے۔



حضرت شاہ عبدالعزیز کے مقدمہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے کم و بیش اتنے ہی حصے کی تفسیر تصنیف کی تھی جتنی عام طور پر دستیاب ہے۔ لیکن کچھ شواہد ایسے بھی ہیں جن کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بعد میں پورے قرآن کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ یہ شواہد حسب ذیل ہیں:

(۱) پہلی دلیل یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز نے فتاویٰ عزیزیہ میں متعدد مقامات پر لکھا ہے کہ ہم یہاں اس آیت کی تفسیر فتح العزیز سے نقل کرتے ہیں۔ اسی طرح سورہ نساء، سورہ سجدہ اور سورہ آل عمران وغیرہ متعدد سورتوں کی تفسیر کے حوالے ہیں۔ ان حوالوں کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تفسیر مکمل لکھی تھی۔

(۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ شاہ رفیع الدین مراد آبادی نے جو حضرت کے معاصر ہیں اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز سلمہ اللہ تعالیٰ نے ایک تفسیر تالیف کی ہے جس کا نام فتح العزیز ہے۔ ابھی اس کے مسودات بیاض کی منزل تک نہیں پہونچے ہیں۔

(۳) تیسری دلیل ہے کہ مولانا عبدالحی لکھنوی نے نزھۃ الخواطر میں لکھا ہے کہ یہ تفسیر کئی ضخیم جلدوں میں تھی۔ اس کا اکثر حصہ ۱۸۵۷ میں سعی انقلاب کے دوران ضائع ہو گیا۔ صرف پہلی اور آخری جلد باقی رہ گئی۔ (۱۲)

مولانا عبدالحی لکھنوی کی تحقیق خود استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے ان کو یقین سے معلوم ہوگا کہ یہ تفسیر مکمل ہو گئی تھی۔

(۴) چوتھی دلیل یہ ہے کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے جس میں سورہ مائدہ کی ۳۰ آیات کی تفسیر ہے۔ کیا عجب ہے کہ یہ اسی تفسیر کی باقیات میں سے ہو۔

(۵) پانچویں دلیل یہ ہے کہ شاہ صاحب کو اپنی تفسیر کے لکھنے پر بڑی مسرت ہوئی تھی۔ ایک خط میں انھوں نے اس تفسیر کو اپنے لیے سرمایہ مسرت بتایا ہے۔ ''تفسیر فتح العزیز وامثال اہل تصانیف را اگر بہ فقیر نسبت کنند موجب شادمانی خاطر می گردد۔''(۱۳)

قرآن مجید کے شروع اور آخر کے حصے تفسیر جو عام طور پر دستیاب ہے وہ انھوں نے اپنی وفات سے اکتیس سال پہلے لکھی تھی اس لیے امکانی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کو اپنی تفسیر پسند بھی تھی اور بعد میں اکتیس سال کا وقفہ بھی ملا، تو اس عرصے میں یہ تفسیر یقینا مکمل کرلی ہوگی۔

(۶) چھٹی دلیل یہ ہے کہ وہ مدت العمر درس قرآن دیتے رہے۔ اس میں کیا استبعاد ہے کہ ان کے درس کو ان کے تلامذہ نے قلم بند کرلیا ہو اور پھر اس کو مکمل تفسیر کی شکل دے دی ہو۔

مولانا برہان الدین سنبھلی نے معارف میں تکملہ تفسیر عزیزی کے ایک ناقص نسخے کا تعارف کرایا ہے۔ اس تکملہ کی چار جلدیں دارالعلوم ندوۃ العلما کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ یہ تکملہ سورہ بقرہ کی آیت وان تصوموا خیر الکم سے پانچویں پارے کے آخر تک ہے۔ اس میں بڑے سائز کے تقریبا تین ہزار صفحات ہیں۔

مذکوہ بالا دلائل سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے قرآن مجید کی مکمل تفسیر لکھی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جنگ آزادی کے ہنگاموں میں اس کا کچھ حصہ ضائع ہوگیا۔ جس کا کچھ حصہ مرور ایام میں ضائع ہوگیا۔ اس لیے بعض حضرات نے یہ دعوی کیا ہے کہ انھوں نے تفسیر عزیزی کا تکملہ لکھا تھا۔

اوپر مذکور گفتگو سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ حضرت شاہ صاحب نے مطبوعہ تفسیر کے علاوہ بھی قرآن مجید کے بقیہ حصوں کی تفسیر لکھی تھی لیکن یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ کیا شاہ عبدالعزیز نے قرآن کی مکمل تفسیر لکھی تھی یا یہ تفسیر ادھوری رہ گئی تھی۔ اس سوال کی وجہ یہ ہے کہ بعض حضرات یہ دعوی کرتے ہیں کہ انھوں نے تفسیر عزیزی کا تکملہ لکھا تھا۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ بظاہر انھوں نے پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی۔ لیکن ان کے سلسلے میں یہ مشہور ہے کہ کچھ لوگوں نے ان کی تفسیر کی تکمیل بھی کی جیسے پروفیسر عضدالدین خاں اور دوسرے لوگوں نے لکھا ہے کہ نواب سکندر جہاں بیگم نے مولوی حیدر علی فیض آبادی کے ذریعے اس کا تکملہ تحریر کروایا، جو ۲ جلدوں پر مشتمل تھا۔(۱۴) بظاہر یہ مبالغہ آرائی ہے۔ جو کتاب خود ۷ ۲ جلد میں نہیں اس کا تکملہ اس سے بڑا کیسے ہوسکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایسا ہوا بھی کہ تفسیر عزیزی کا کوئی تکملہ لکھا گیا تو اس کی وجہ لازمایہ نہیں ہوگی کہ یہ تفسیر ادھوری رہ گئی

تھی۔اس کی وجہ غالبا یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب اصل تفسیر ضائع ہوگئی تو جو حصے موجود تھے ان کے علاوہ دوسرے حصوں کی تفسیر لکھی گئی ہو اور اس کو تکملہ کا نام دیا گیا ہو۔

مولانا برہان الدین سنبھلی نے معارف میں تکملہ تفسیر عزیزی کے ایک ناقص نسخے کا تعارف کرایا ہے۔اس تکملہ کی چار جلدیں دارالعلوم ندوۃ العلما کے کتب خانے میں موجود ہیں۔یہ تکملہ سورہ بقرہ کی آیت وان تصوموا خیر الکم سے پانچویں پارے کے آخر تک ہے۔اس میں بڑے سائز کے تقریبا تین ہزار صفحات ہیں۔(۱۵) سر دست اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔یہ تحقیق کا مسئلہ ہے کہ اس تکملہ کا استناد کتنا صحیح ہے۔لیکن پھر بھی دو باتیں توجہ طلب ہیں ایک یہ کہ کسی بھی کتاب کا تکملہ کسی بھی کتاب کے آخر کا ہوتا ہے، شروع کا نہیں۔دوسرا یہ کہ سورہ بقرہ کی تفسیر تو سب کے نزدیک حضرت شاہ صاحب لکھ ہی چکے تھے پھر اس کے تکملے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تکملہ کے نام سے جو کتاب لکھی گئی وہ دراصل ضائع شدہ حصوں کی تفسیر تھی واقعتا تکملہ نہیں تھی۔

مولوی رحمان علی نے تفسیر فتح العزیز کو سورہ بقرہ اور قرآن کے آخری دو پاروں کی تفسیر لکھا ہے۔(۱۶) لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی تھی۔رحمان علی نے معروف ومشہور بات نقل کردی۔ورنہ انھوں نے تفسیر تو پوری لکھی تھی جیسا کہ اوپر دلائل کے ذریعے ثابت کیا جا چکا ہے۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کی تفسیر کا اتنا حصہ ہی کیوں شہرت پذیر ہوا جس کا تذکرہ انھوں نے اپنے مقدمے میں کیا ہے اور بقیہ حصہ معروف کیوں نہیں ہوا۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے شروع اور آخری حصے کی تفسیر پہلے لکھی تھی اور اس کو عوام کے درمیان شائع بھی کردیا تھا چوں کہ ان کا اصل مقصد اسی حصے کو عوام میں معروف کرانا تھا اس لیے ان دونوں حصوں کی شہرت زیادہ ہوگئی۔بقیہ حصے بعد میں لکھے تھے ان کی اشاعت بھی اس پیمانے پر نہیں ہوئی تھی اور ہوسکتا ہے کہ ان حصوں پر نظر ثانی بھی کرنے کا خیال ہو،اس لیے ان کی اتنی شہرت نہیں ہو پائی۔دوسرا حادثہ یہ گزرا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز انگریزوں کے خلاف تھے، اس لیے ۱۸۵۷ کی سعی انقلاب کے ناکام ہونے کے بعد انگریزوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز کی باقیات سے بھی انتقام لیا۔جیسے ان کی مسجد شہید کردی۔ظاہر ہے اس میں ان کا کتب خانہ بھی ضائع ہوگیا اس طرح یہ عظیم تفسیر ہندستانی جنگ آزادی کی نذر ہوگئی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کی تفسیر کے ضائع ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ دستیاب تفسیر کے مقدمے سے پوری طرح واضح ہے کہ انھوں نے سورہ بقرہ کی تفسیر مکمل لکھی تھی لیکن اب مطبوعہ تفسیر میں صرف ایک پارہ کی تفسیر ملتی ہے اور دوسرے پارے کے ابتدائی حصے کی تفسیر ملتی ہے اور کتاب اس طرح ختم ہوتی ہے کہ جس آیت کی تفسیر کر رہے تھے وہ بھی ادھوری ہے۔بظاہر ہوا یہی ہے کہ اس کا نسخہ بھی ضائع ہوگیا۔اشاعت کے وقت جتنا مل سکا اتنا شائع کردیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز نے شروع میں سورہ بقرہ اور آخری دو پاروں کی تفسیر لکھی تھی۔وہ لوگوں میں بہت

مقبول ہوگئی۔ بعد میں انھوں نے پورے قرآن کی تفسیر لکھی۔ اس کو ویسی شہرت حاصل نہ ہوسکی اور ۱۸۵۷ میں اس کا اکثر حصہ ضائع بھی ہوگیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز نے اس تفسیر کے مقدمہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے اس تفسیر کی تالیف میں کسی کتاب سے مراجعہ نہیں کیا۔ یعنی یہ تفسیر مکمل طور پر بغیر کسی دوسری تفسیر کے فوری مراجعہ کے لکھی گئی تھی۔ علم کا یہ بحر ذخار صرف حضرت شاہ عبدالعزیز کے حافظے اور قدیم مطالعہ پر مبنی تھا۔ مشہور ہے کہ تفسیر عزیزی کے بارے میں مولانا انور شاہ کشمیری فرمایا کرتے تھے کہ اگر تفسیر عزیزی مکمل ہوجاتی تو پوری امت کی طرف سے قرآن کا ایک حق ادا ہوجاتا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کی علوم اسلامی پر کیسی دقیق نظر تھی۔ تفسیر عزیزی میں احادیث، ان کے روات ان کے حوالوں وغیرہ کا جس طرح اہتمام ہے وہ کوئی حافظ حدیث ہی کرسکتا ہے۔

تفسیر فتح العزیز کی تالیف کے دوران مشکلات

تفسیر فتح العزیز اگرچہ املا کرائی گئی تھی، لیکن اس کی تصنیف کے وقت حضرت شاہ صاحب کے سامنے بہت سی مشکلات تھیں، جو اس تفسیر کی تصنیف میں ممکنہ رکاوٹیں بن رہی تھیں۔ جیسے حضرت شاہ عبدالعزیز نے اس تفسیر کے مقدمے میں لکھا ہے کہ مفسر کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر استعداد بلند، فطرت ارجمند، معنی آفرینی پر قدرت، تخیل کی بلند پروازی کی طاقت، مبدأ فیاض سے خصوصی ربط، صفائے باطن کے اصولوں پر کاربند دل، ظاہری طور پر اطمینان، باطنی طور پر سکون وطمانیت حاصل ہو۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ یہ سب صلاحیتیں مفسر کے لیے ضروری ہیں لیکن میرے اندر یہ سب مفقود ہیں۔ ان مسائل کے ساتھ کچھ ایسے مسائل ہیں جو مفقود ہونے چاہئیں، لیکن وہ سب میرے اندر موجود ہیں۔ جیسے یکسوئی کو متاثر کرنے والے اور باطنی اطمینان کو مفقود کرنے والے اسباب نہیں ہونے چاہئیں، وہ سب ہیں۔ اوپر سے امراض گھیرے ہوئے ہیں، طرح طرح کی پریشانیاں مسلط ہیں، دل و دماغ ضعیف ہیں اور حالات کی تنگی ہے۔ یہ سب احوال اس تفسیر کے لکھنے میں مانع ہیں۔ یعنی مثبت امور ناپید ہیں اور منفی امور کا ہجوم ہے۔ اس کے باوجود ان نامساعد حالات میں یہ تفسیر لکھی گئی۔ جب یہ تفسیر مکمل ہوگئی تو خود ان کے بقول یہ مجموعہ کشکول کی طرح بن گیا جس میں ہر قسم کی نعمتیں ایک ساتھ فراہم ہیں۔ یا خرقہ گدائی کی طرح ہوگیا جس میں طرح طرح کے پیوند لگے ہیں۔ یعنی اس میں مختلف قسم کے نکات ومعانی جمع ہوگئے ہیں۔

ایک بات کی وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ اوپر جو باتیں انھوں نے لکھی ہیں ان کا تعلق فن تفسیر کی شرائط سے نہیں ہے۔ علوم و فنون کے تو وہ خود بحر ذخار تھے۔ مفسر کے لیے جو فنی شرائط ہیں ان کا مسئلہ نہیں ہے وہ تو ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھے۔ یہ سب ظاہری مسائل وعوارض تھے، جن کی طرف حضرت شاہ صاحب نے اشارہ کیا ہے۔

تفسیر فتح العزیز کی خوبیاں

تفسیر فتح العزیز میں بڑی خوبیاں ہیں سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں تاہم چند اہم خوبیوں کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

زبان کی سادگی:

تفسیر فتح العزیز عام مسلمانوں کے لیے لکھی گئی تھی اس کا مقصد نکتہ آفرینی نہیں تھا بلکہ قرآن کے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچانا تھا۔اس لیے حضرت شاہ صاحب نے اس تفسیر کو نہایت سادہ زبان میں لکھا ہے۔اس کا اسلوب نگارش بھی عام فہم اور سادہ ہے۔اس بات کا ذکر خود حضرت شاہ صاحب نے بھی اس کے مقدمے میں کیا ہے کہ:

''اس کتاب میں ایسی سادہ فارسی زبان استعمال کی گئی ہے جو اس علاقے میں رائج ہے اور جو تمثیلات لوگ جانتے ہیں انہی کو شامل کیا گیا ہے۔عربی تفسیروں کی غیر ضروری طوالت کو حذف کر دیا ہے اور بعید از فہم توجیہات کو چھوڑ دیا ہے۔اسی طرح ضعیف روایات پر نقد و جرح بھی کی ہے۔''(۱۷)

اس تفسیر کی سب سے اہم خوبی اس کی سادگی اور اس کا عام فہم ہونا ہے۔

سورہ کا تعارف

حضرت شاہ عبدالعزیز نے تفسیر میں سورتوں کے تعارف کو بھی شامل کیا ہے۔یہ ان کی ایسی ندرت ہے کہ شاید تفسیر کی تاریخ میں یہ ایک انقلابی قدم ہو۔بعد میں دوسرے مفسرین خاص طور پر اردو کے مفسرین نے یہ روش اختیار کی۔حضرت شاہ صاحب کسی بھی سورت کی تفسیر لکھنے سے پہلے اس سورت کا تعارف کرواتے ہیں۔یہ تعارف بہت جامع ہوتا ہے اور اس میں ایک طرف تو اس سورت کے مفاہیم پوری طرح آجاتے ہیں دوسری طرف سورت کے متعلقات سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔سورت کا تعارف گویا قاری کے لیے ہدایت نامہ ہے کہ یہ سورت ایسی ہے اور اس میں ان باتوں پر اس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔اس تعارف کو پیش نظر رکھ کر سورت کا مطالعہ کرنے سے سورت کے مفاہیم کی کشود زیادہ بہتر طریقے پر ہوتی ہے۔اگرچہ سورتوں کے اس مقدمہ میں جزوی طور پر تنوع ہے اور اس میں سورت کے مفہوم بیان کرنے کا اسلوب بدلتا رہتا ہے تاہم عام طور پر درج ذیل پہلو ہر جگہ زیر بحث رہتے ہیں۔

تفسیر فتح العزیز عام مسلمانوں کے لیے لکھی گئی تھی اس کا مقصد نکتہ آفرینی نہیں تھا بلکہ قرآن کے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچانا تھا۔اس لیے حضرت شاہ صاحب نے اس تفسیر کو نہایت سادہ زبان میں لکھا ہے۔اس کا اسلوب نگارش بھی عام فہم اور سادہ ہے۔

۱۔سورہ کی فضیلت

سورت کے مقدمہ میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ احادیث میں اس سورہ سے متعلق کیا فضائل بیان کیے گئے ہیں۔احادیث کو راوی کے نام کے ساتھ اور کتاب کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔اگر اس سورت سے متعلق بزرگوں کے کچھ معمولات ہوں تو ان کو

بھی نام کی صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

۲۔آیات کی تعداد

ہر سورت کے مقدمے میں اس سورت کی آیات کی تعداد، اس سورت کے کلمات کی تعداد اور سورت کے حروف کی تعداد بھی بیان کرتے ہیں۔

۳۔مکی و مدنی

مقدمہ کے شروع میں ہی یہ واضح کر دیتے ہیں کہ یہ سورہ مکی ہے یا مدنی اور اگر اس میں کسی بھی قسم کا اختلاف ہو تو اس کو بھی بیان کر دیتے ہیں۔

> شاہ عبدالعزیز کا خاص کمال یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر قرآن مجید کی تفسیر قرآنی آیات سے کی ہے۔یعنی کسی بھی آیت کے معنی متعین کرنے کے لیے وہ زیادہ اعتماد قرآن پر کرتے ہیں اس کے لیے وہ قرآن مجید کی مختلف آیات سے نظائر پیش کرتے ہیں۔

۴۔گزشتہ سورت سے ربط

مقدمہ کے شروع میں یہ بتاتے ہیں کہ اس سورت کا پچھلی سورت کے ساتھ کیا ربط ہے۔سورتوں کے درمیان میں ربط کا یہ بیان بڑا دل چسپ ہوتا ہے اور اس کے ضمن میں تفسیر بہت سے مشکل مقامات کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔جیسے سورت ملک میں لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے سورت تحریم میں ایک گھر چلانے کی بات کہی گئی ہے اور اس سورت میں ایک ملک چلانے کی بات ہے۔گھر کی سرداری سے کائنات کی سروری کی طرف عروج ہے۔اس کے علاوہ بھی ربط کی متعدد وجوہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔

حضرت عبدالعزیزی کے یہاں ربط کا مطلب صرف ربط نہیں ہوتا بلکہ وہ دونوں کے درمیان مناسبت بھی تلاش کرتے ہیں۔مثال کے طور پر سورت شمس اور سورت لیل کے درمیان مناسبت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سورہ شمس اور اس سورت کے درمیان مناسبت و ربط مختلف وجوہ سے ہے، مثلاً

(ا) دونوں میں یہ مناسبت ہے کہ دونوں کی ابتدا قسم سے ہوتی ہے۔

(ب) سورت شمس میں انسانی نفوس کا مختلف ہونا بیان ہوا تھا کہ بعض کے دل میں تقوی و نیکی کا الہام ہوتا ہے اور بعض کے دل میں بُرائی ڈالی جاتی ہے اور یہ کہ بعض لوگ نفس کی پاکیزگی میں مشغول ہیں اور بعض شہوت و غضب کی پیروی کرتے ہوئے اپنے نفس کو ذلیل و خوار کرنے میں مشغول ہیں اور اس سورت میں انسان کے اعمال و افعال کا اختلاف بیان کیا گیا ہے، کہ بعض کو سعادت و نیک بختی کے اعمال کی توفیق دی گئی ہے اور بعض بدبختی کے اعمال کرتے ہیں اور بُرائی کے راستے ان کے لیے آسان کر

دیئے گئے ہیں (تو دونوں سورتوں میں بیان اختلاف کی مناسبت ہوئی)

(ج) دونوں سورتوں میں مخصوص بدبختوں کا حال بھی بیان ہوا ہے چنانچہ سورت شمس میں قذار بن سالف کا حال بیان ہوا اور اس سورت میں ایک اور بڑے بدبخت کا حال بیان ہوا جو اس اُمت کے ابتدائی دور میں تھا، یعنی امیہ بن خلف، یہ ظالم شخص حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو سخت ترین اذیتیں دیا کرتا تھا، اور حضرت بلال جو محبت وفیض نبوی کی وجہ سے اس عظیم مقام تک پہنچ گئے تھے گویا حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے مشابہ تھے۔(۱۸)

۵۔سورہ کا نام

سورتوں کے نام اللہ کی طرف مقرر کردہ ہیں یعنی توقیفی ہیں۔ہر نام کی کوئی وجہ ہے، جو بہت واضح طور پر قرآن میں مذکور نہیں ہے اس لیے حضرت شاہ عبدالعزیز تفسیر کے ساتھ مختلف سورتوں کے نام رکھنے کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔یہ وجوہات عقلی ہوتی ہیں، تاہم ان کے ضمن میں سورہ کے مضامین کا بھی تعارف ہو جاتا ہے۔

سورہ کے مضامین کا خلاصہ

حضرت شاہ صاحب کی طرف سے سورتوں کے تعارف میں یہ ایک غیر معمولی اہمیت کا اضافہ ہے کہ تفسیر شروع کرنے سے قبل پوری سورت کا خلاصہ چند الفاظ میں ایک صفحہ یا آدھے صفحہ میں بیان کر دیتے ہیں۔اگر قاری کے ذہن میں صرف شاہ صاحب کا بیان کردہ یہ مفہوم بھی ہو تو وہ سورت کے پورے مفاہیم سے بخوبی واقف ہو جائے گا اور اس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس سورت میں کیا مضامین بیان کیے گئے ہیں اور اس سورت میں عام انسان کے لیے کیا باتیں یاد رکھنے اور عمل کرنے کی ہیں۔

شان نزول

سورت کے تعارف میں عام طور پر مختلف سورتوں کے شان نزول کو بھی بیان کرتے ہیں۔شان نزول کی بھی قرآن فہمی میں غیر معمولی اہمیت۔

حضرت شاہ صاحب کا معمول ہے کہ مذکورہ امور کی نشان دہی کرنے کے علاوہ سورت کے مقدمہ میں بعض دیگر امور کا بھی بیان کرتے ہیں جو خاص اس سورت سے متعلق ہوں جیسے کسی لفظ کی تحقیق یا کسی تاریخی واقعہ کی تفصیل وغیرہ۔سورتوں کا یہ تعارفی مقدمہ کئی کئی صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔خود حضرت شاہ عبدالعزیز کی نظر میں اس مقدمہ کی بڑی اہمیت تھی اس کی خصوصی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے اس کا بھی اہتمام کیا ہے کہ جب ایک سورت کا تعارف یعنی اس کا مقدمہ مکمل ہو جاتا ہے تو باضابطہ لکھتے ہیں کہ مقدمہ مکمل ہو گیا ہے الحمدللہ۔

اصل تفسیر

ہر سورت کی تفسیر میں ان کا معمول یہی ہے کہ پہلے سورہ کی تفسیر کا مقدمہ لکھتے ہیں اس کے بعد اصل تفسیر شروع ہوتی ہے۔اصل

تفسیر میں ان کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ایک آیت یا آیت کے جزء کو لیتے ہیں، اس کے معنی بیان کرتے ہیں، پھر اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ یہ تفسیر بہت عملی قسم کی ہوتی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ:

قرآن کی تفسیر قرآن سے

شاہ عبدالعزیز کا خاص کمال یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر قرآن مجید کی تفسیر قرآنی آیات سے کی ہے۔ یعنی کسی بھی آیت کے معنی متعین کرنے کے لیے وہ زیادہ اعتماد قرآن پر کرتے ہیں اس کے لیے وہ قرآن مجید کی مختلف آیات سے نظائر پیش کرتے ہیں جیسے:

جب بندہ کو یہ تعلیم دی کہ راہ راست طلب کرے تو اس کا تقاضا تھا کہ راہ یابوں کا بھی تذکرہ کر دے، تا کہ نیک و بد راہ میں امتیاز کر سکے اور ہر مذہب کے لوگ اس کے مدعی ہیں کہ ہم راہ راست پر ہیں..... چنانچہ راہ راست کی تفصیل صراط الذین انعمت علیہم کے ذریعہ بیان کی یعنی ان لوگوں کی راہ جن پر انعام و اکرام ہوا، اور اس کی تفسیر سورہ نساء کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا۔ (سورۃ نساء، آیت ۶۹) معلوم ہوا کہ راہ راست انہی چار ملتوں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ ہے اور بندہ کو خدا سے التجا کے وقت انہی کو نظر میں رکھنا چاہیے اور انھی کی محبت طلب کرنی چاہیے۔ اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اھدنا الصراط مستقیم راہ حق کی مہربانی ہے اور صراط الذین انعمت علیہم طلب رفیق کے موضوع پر مشتمل ہے (۱۹)

ربط آیات

تفسیر عزیزی میں جس طرح سورتوں کا ربط بہت اہتمام اور گہرائی کے ساتھ بیان کیا ہے اسی طرح مختلف آیات کو باہم مربوط کیا ہے۔ ہر آیت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس کا پچھلی آیت سے کیا رابطہ ہے۔ بعض اوقات وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ پچھلی سورت کی فلاں آیت اس سورت کی اس آیت سے مربوط ہے۔ یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ حضرت کی نظر میں ربط کا مطلب مناسبت ہوتا ہے۔

نکات

تفسیر عزیزی میں اس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ اگر مختلف آیات کی تفسیر کے ضمن میں اگر بحث طلب امور ہوں، یا عصری اہمیت کے مسائل ہوں تو ان کو بھی مفصل بیان کرتے ہیں۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان کی تفسیر کا اصل حصہ یہی ہے۔ اس حصے میں آیات سے مستفاد دقیق معانی اور حکمتوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ الفاظ کی خاص طور پر تحقیق کرتے ہیں۔ اگر سوالات پیدا ہو رہے ہوں تو ان کو بیان کر کے ان کے جوابات دیتے ہیں۔ مثلاً:

> ''سورہ ملک کی تفسیر میں سب سے پہلے برکت کے معنی بیان کیے ہیں کہ برکت کا مطلب ہے کسی چیز میں خیر کا ظاہر ہونا اور اس خیر کا ہمیشہ رہنا، پھر ملکوت کے معنی کی وضاحت کی ہے۔ سورہ یٰسین کے حوالے سے اس کے معنی کی مزید وضاحت کی ہے۔ اسی طرح

آگے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موت اور حیات کو پیدا کیا۔ یہاں دو سوال وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ حیات موت پر مقدم ہے تو اس آیت میں موت کو مقدم کیوں کیا گیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ حیات کو پیدا کرنا تو معروف ہے، لیکن موت تو حیات کے زوال کا نام ہے، پھر اس کی تخلیق کا کیا مطلب ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان دونوں سوالوں کا جواب دیا ہے اور پوری تفسیر میں یہی طریقہ رائج ہے۔"(۲۰)

حروف مقطعات

تفسیر عزیزی کے دستیاب حصوں میں حروف مقطعات کم ہیں اس لیے یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ حروف مقطعات کی تشریح میں ان کا پورا ذوق کیا تھا۔ تاہم بعض جگہ انھوں نے معنی بیان کیے ہیں۔ حالاں کہ تفسیر فتح العزیز کا یہ پہلو بہت مستند نہیں معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً انھوں نے سورہ ن میں لفظ نون کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس سورۃ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ نون ابجد کے حساب سے پچاس کے عدد پر دلالت کرتا ہے اور اس سورۃ کی آیات جن پر اتفاق ہے پچاس ہیں۔ نیز حضور ﷺ کی نبوت کا زمانہ پچاس سال تھا۔ ۲۳ سال خود بنفس نفیس حیات ظاہری کی حالت میں وسادہ نبوت پر جلوہ افروز رہے اور اس کے بعد آپ سرکار کے خلفاء ۷۲ سال تک اسی طرز اور قانون پر عمل کر کے تشریف لے گئے جب حضور ﷺ کے وصال شریف کے ستائیسویں سال خلیفہ وقت کو حکم بنانے کے واقعہ میں اُتارا اور معزول کیا گیا تو دور نبوت منقطع ہوگیا۔۔۔ن کا حرف سر نبوت ہے۔ نیز حرف ن کو اس سورۃ کے مطالب سے ہر عمدہ مطلب میں دخل ہے اس لیے کہ پہلے اس سورت میں حضور علیہ السلام پر اپنی نعمت بیان کر کے جنون کی نفی فرمائی ہے پھر آپ کو نہ ختم ہونے والے اجر کا وعدہ دیا گیا اور آپ کے دشمنوں کو مفتون فرمایا اس کے بعد کافروں کے بارے میں سستی کرنے سے منع فرمایا خصوصاً وہ کافر جس سے اللہ تعالیٰ کی توہین ظاہر ہوئی ہو۔۔۔"(۲۱)

خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر فتح العزیز اپنے وقت کی بہترین تفسیر ہے۔ اس تفسیر کا مقصد قرآن مجید کو عام لوگوں میں رائج کرنا تھا، بلکہ قرآن مجید کا جو حصہ لوگوں میں رائج اس حصے کو ہی عوام الناس کے لیے قابل فہم بنانا تھا۔ اس لیے اس میں نہایت آسان زبان ہے اور دقیق مسائل کی جگہ عملی قسم کے بیان کیے گئے ہیں تاکہ ذہنی مشق سے زیادہ اعضا و جوارح کی مشق ہو اور قرآن مجید کا عملی پہلو ابھر کر سامنے آئے۔

حواشی

۱۔ مولانا نسیم احمد فریدی: تذکرہ حضرت شاہ عبدالعزیز، الفرقان بک ڈپو لکھنو، ۱۹۹۲ء، ص: ۶۲

۲۔ایضاً،ص:۲۵
۳۔ابوالفرید امام الدین:تفسیر عزیزی المعروف بہ وعظ عزیزی،مطبع انصاری،دہلی،بدون سنہ،ص:۴
۴۔مولانا عبدالحیٔ لکھنوی:نزہۃ الخواطر،دارابن حزم،بیروت،۱۹۹۹،جلد ۷ ص:۱۰۱۴
۵۔تفسیر فتح العزیز چند حقائق کی روشنی میں،از پروفیسر عضد الدین خاں صاحب،مشمولہ ماہنامہ معارف،جلد ۱۰۰ شمارہ ۳،ستمبر ۱۹۶۷
۶۔تذکرہ حضرت شاہ عبدالعزیز،ص:۲۴
۷۔ایضاً،ص:۲۳
۸۔ابوالفرید امام الدین اپنے وقت کے معروف عالم ہیں خاندان ولی اللہی کے شاگرد تھے اس لیے ان کو لوگ حجۃ اللہی کہا کرتے تھے۔لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے دینی علوم کے علاوہ فلکیات وغیرہ کا بھی اچھا علم تھا۔نزہۃ الخواطر،جلد ۷،ص:۹۲۴
۹۔تفسیر فتح العزیز چند حقائق کی روشنی میں،از پروفیسر عضد الدین خاں صاحب،مشمولہ ماہنامہ معارف،جلد ۱۰۰ شمارہ ۳،ستمبر ۱۹۶۷
۱۰۔تفسیر عزیزی المعروف بہ وعظ عزیزی،مطبع انصاری،دہلی،بدون سنہ
۱۱۔ماہنامہ معارف،جلد ۱۰۰ شمارہ ۳،ستمبر ۱۹۶۷
۱۲۔نزھۃ الخواطر،جلد ۷،ص ۲۷۳
۱۳۔فتاویٰ عزیزیہ
۱۴۔معارف،ستمبر ۱۹۶۷
۱۵۔تکملہ تفسیر فتح العزیز از مولانا بربان الدین سنبھلی،مشمولہ معارف،مئی ۱۹۸۹
۱۶۔رحمان علی:تذکرہ علمائے ہند،تحقیق وترجمہ،ایوب قادری،کراچی ۱۹۶۱،ص:۳۰۲
۱۷۔تفسیر عزیزی (فارسی)،ص ۳
۱۸۔تفسیر فتح العزیز،اردو ترجمہ محمد محفوظ الحق،لاہور ۲۰۰۸،جلد ۴،ص:۳۸۲
۱۹۔ایضا،جلد اول،ص:۸۵
۲۰۔ایضا،جلد ۳،ص:۱۵
۲۱۔ایضاً،ص:۴۸۔۴۹

سنت اور صاحب سنت



امام ابن جوزی کی سیرت نگاری

عبدالقدوس - ڈاکٹر محمد شہباز

پیغمبر اسلام کے احوال کو محفوظ اور مدون کرنے کا جذبہ صدر اول ہی سے اہل اسلام کے ہاں بڑی سعادت کا باعث رہا ہے۔ سیرت نگاری کا سلسلہ پہلی صدی ہجری سے لے کر تا حال بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ جاری ہے۔ اس ضمن میں اولین سیرت نگار موسیٰ بن عقبہ (141ھ)، امام المغازی محمد بن اسحاق (150ھ)، سید المؤرخین محمد بن عمر الواقدی (207ھ)، عبدالملک بن ہشام (312ھ) اور قاضی عیاض مالکی (544ھ) سے لے کر عصر حاضر کے قابل رشک سیرت نگاروں تک ایک طویل سلسلۃ الذہب ہے، جنھوں نے سیرت نگاری کے مختلف اسالیب اور مناہج اختیار کیے ہیں۔ ان اسالیب میں مفسرانہ اسلوب، محدثانہ اسلوب، مؤرخانہ اسلوب، فلسفیانہ اسلوب، متصوفانہ اسلوب، ادبی اسلوب اور حرکی اسلوب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گزشتہ صدی سے سیرت نگاروں

> "سوانح نگاری کی ضرورت و اہمیت اور اس سے اپنے خاص لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ''صید الخاطر'' میں لکھا ہے کہ میری نظر میں فقہ کا اشتغال اور حدیث کا سماع قلب کی اصلاح کے لیے ناکافی ہے، اس میں رقت آمیز باتوں اور سلف الصالحین کی سیرت کی آمیزش ضروری ہے، کیوں کہ ان صالح لوگوں نے نقل (قرآن و حدیث) کے مقصود کو حاصل کر لیا ہے اور اعمال کی ظاہری صورت سے ہٹ کر ان کی حقیقت اور مراد کو پالیا ہے۔"

اور کتب سیرت کے تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ان سطور میں ابن جوزی (510-597ھ) کے سیرت طیبہ ﷺ پر کام کا ناقدانہ اور تجزیاتی مطالعہ پیش نظر ہے۔ اگرچہ ابن جوزی پر علوم القرآن کے حوالے سے بہت عمدہ کام ہوا ہے۔ مثلاً ''ابن جوزی کی علوم القرآن پر مصنفات کا تحقیقی جائزہ'' کے موضوع پر پنجاب یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام ہوا ہے۔ ابن جوی بحیثیت سیرت نگار'' کے عنوان سے سرگودھا یونی ورسٹی سے عبدولقدوس (اس مقالے کے شریک مصنف) نے ایم فل سطح کا تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے۔ اسی طرح ناسخ و منسوخ سے متعلق ابن جوزی کے موقف پر دو ریسرچ آرٹیکل لکھے گئے ہیں۔ پنجاب یونی ورسٹی سے شائع ہونے والے تحقیقی مجلے القلم میں ایک ریسرچ آرٹیکل ''کتب طبقات اور تدوین سیرت'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں ابن جوزی کی کتاب ''صفۃ الصفوۃ'' کو کتب طبقات میں شامل کرتے ہوئے، بطور ماخذ سیرت بحث کی گئی ہے۔ تاہم ان کی کتاب ''الوفا باحوال المصطفیٰ'' کے اسلوب پر کوئی قابل ذکر تحقیقی کام ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اس آرٹیکل

میں، تحقیق اور تجزیے کی روشنی میں یہ جاننے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ابن جوزی نے اپنی اس کتاب میں سیرت نگاری کا کون سا منہج اختیار کیا ہے؟ اگر محدثانہ منہج اختیار کیا ہے، تو وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟ اس ضمن میں ان کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟ وہ کون سے اسباب ہیں، جن کی بنا پر ابن جوزی پر نقد کیا گیا ہے؟ محدثانہ منہج اختیار کرنے والے دیگر سیرت نگاروں کے درمیان ان کا مقام کیا ہے؟ لیکن ان امور پر بحث سے پہلے ابن جوزی اور ان کی کتب سیرت کا مختصر تعارف پیش کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ابن جوزی کا مختصر تعارف

امام ابن جوزی کی ولادت 510ھ میں بغداد میں ہوئی۔ نام عبدالرحمن، کنیت ابوالفرج اور لقب جمال الدین تھا۔ تاہم اپنے سلسلۂ نسب میں نویں پشت پر جعفر جوزی کی نسبت سے ابن جوزی معروف ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب انیسویں پشت پر خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق (634ء) سے جاملتا ہے۔ آپ نے ستاسی (87) سال کی عمر میں 597ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ ابن جوزی نے علم تفسیر میں چوٹی کے مفسر، علم حدیث میں جلیل القدر حافظ، علم تاریخ میں وسیع معلومات رکھنے والے مؤرخ، بے مثال سیرت نگار، حنابلہ کے مایہ ناز فقیہ، واعظ آفاق اور عالم عراق کی حیثیت سے اپنا نام پیدا کیا۔ آپ پہلے آدمی تھے، جنھوں نے منبر پر مجلس وعظ کے دوران قرآن کریم کی تفسیر مکمل کی۔

ابن جوزی عالم اسلام میں کثرت تصنیف کے حوالے سے معروف ہیں اور ہر موضوع پر ان کی متعدد قیمتی کتب موجود ہیں۔ تاہم ان پر اوہام اور اغلاط کے حوالے سے شدید اعتراض بھی کیا گیا ہے۔ اس عیب کا سبب کثرت تصنیف، تالیف میں جلد بازی اور نظر ثانی نہ کرنا ہے۔(5)

ابن جوزی اور سرمایہ سیرت المصطفی ﷺ

ابن جوزی کو سوانح نگاری سے خاص شغف تھا۔ آپ نے نبی رحمت ﷺ کی سیرت کے علاوہ حضرت عمر فاروق (644ء)، سعید ابن المسیب (94ھ)، عمر بن عبدالعزیز (101ھ)، حسن بصری (110ھ)، ابراہیم بن ادہم (162ھ)، معروف کرخی (200ھ)، امام احمد بن حنبل (241ھ) اور دیگر کئی بزرگان دین کی سوانح پر کتب تالیف کیں۔ سوانح نگاری کی ضرورت و اہمیت اور اس سے اپنے خاص لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ''صید الخاطر'' میں لکھا ہے کہ میری نظر میں فقہ کا اشتغال اور حدیث کا سماع قلب کی اصلاح کے لیے ناکافی ہے، اس میں رقت آمیز باتوں اور سلف الصالحین کی سیرت کی آمیزش ضروری ہے، کیونکہ ان صالح لوگوں نے نقل (قرآن وحدیث) کے مقصود کو حاصل کرلیا ہے اور اعمال کی ظاہری صورت سے ہٹ کر ان کی حقیقت اور مراد کو پالیا ہے۔

ابن جوزی کو سیرت طیبہ ﷺ سے بھی خاص شغف اور خصوصی لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اس موضوع پر ان کی دو مستقل کتب موجود ہیں۔ مزید یہ کہ دیگر دو کتب کے ابتدا میں سینکڑوں صفحات سیرت طیبہ ﷺ سے مزین ہیں۔ ذیل میں ان کی

مستقل اور جزوی طور پر سیرت طیبہ ﷺ پر مشتمل کتب کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔(6)

الوفا بأحوال المصطفٰی ﷺ

ابن جوزی کے سیرتی ادب میں اہم اور بنیادی کتاب ''الوفا بأحوال المصطفیٰ'' ہے۔ یہ کتاب سیرت کا ایک جامع اور مستند ذخیرہ ہے، جس میں انھوں نے سیرت طیبہ ﷺ سے متعلق تمام اہم مباحث کو جمع کیا ہے۔ الوفاء کے پانچ سو (500) ابواب میں نبی رحمت ﷺ کے سوانح حیات، فضائل و مناقب، جملہ انبیاے کرام پر فضیلت، حلیہ مبارک، اوصاف و خصائل، عبادات، دلائل نبوت، شواہد رسالت، معجزات، غزوات، مکاتیب اور فضائل اور درود وسلام وغیرہ کو مستند دلائل کی روشنی میں نقل کیا گیا ہے۔ الوفاء کا خود مصنف کے ہاتھ سے لکھا ہوا نسخہ آج ناپید ہے۔ اسے سب سے پہلے مصطفیٰ عبدالواحد نے ایڈٹ کیا۔ ایڈیٹر نے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود کتاب کے پانچ مخطوطات کی نشان دہی کی ہے، جن میں مكتبة الأزهر، المكتبة التيموريه، المتحف البريطاني، برلن اور تیونس میں الزیتونة شامل ہیں۔(7) ان مخطوطات میں صرفی اور نحوی غلطیاں موجود تھیں جنھیں جدید ایڈیشن میں دور کر دیا گیا ہے۔ الوفاء کا اردو ترجمہ حامد اینڈ کمپنی لاہور سے طبع ہوا ہے۔

> چوتھی اور آخری کتاب کا نام ''تلقيح فهوم اهل الأثر فی عيون التاريخ والسير'' ہے۔ پہلے اس کتاب کا کچھ حصہ لندن سے ''تلقيح فهوم اهل الأثر في مختصر السير والاخبار'' کے عنوان سے 1892ء میں طبع ہوا۔ پھر مکمل کتاب دہلی سے موجودہ نام کے ساتھ 1916ء میں شائع ہوئی۔ یہ تصنیف متعدد علوم وفنون کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔

مولد النبی ﷺ/مولد العروس

سیرت طیبہ ﷺ پر آپ کی دوسری اہم کتاب کا نام ''مولد النبی'' ہے۔ بعض علما سے اس کا نام ''مولد العروس'' منقول ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کتاب کے تین مخطوطات جو ''جامعۃ الملک سعود ریاض'' میں موجود ہیں، ان پر عنوان ''مولد النبی'' لکھا ہے، لیکن محققین نے انھیں ''مولد العروس'' کے مخطوطات قرار دیا ہے۔ تاہم یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ دونوں مستقل کتابیں ہیں۔ البتہ ابن جوزی کے نواسے سبط ابن الجوزی (654ھ) نے مولد النبی کو امام کی تالیفات میں نقل نہیں کیا۔ کتاب کے تین مخطوطات ''جامعۃ الملک سعود ریاض'' میں موجود ہیں۔ پہلا مخطوطہ عمر نے 1248ھ میں، دوسرا محمد بن احمد النوبی نے 1278ھ میں اور تیسرا قاسم بن احمد نے 1288ھ میں لکھا۔ اس کے علاوہ بھی کتاب کے کچھ مخطوطات دیگر کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں جن کی تعداد تقریباً سات ہے۔ لیکن سوائے ایک مخطوطے کے دیگر نامکمل ہیں۔ مولد النبی کا اردو ترجمہ ''بیان المیلاد النبوی'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں دائیں جانب عربی متن اور بائیں جانب اس کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح ''مولد العروس'' کا اردو ترجمہ عربی متن کے ساتھ ''ذکر میلاد رسول'' کے نام سے چھپا ہے۔ اس کا متن کافی حد تک پہلے مخطوطے سے مناسبت رکھتا ہے، تاہم حیرت انگیز طور پر اکثر صفحات میں

بہت زیادہ اختلاف پایا گیا ہے۔اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ابن جوزی نے جو کتاب لکھی تھی، آج وہ اپنی اصل شکل میں دستیاب نہیں ہے۔

صفة الصفوة

صفة الصفوۃ درحقیقت کتب طبقات سے تعلق رکھتی ہے۔یہ کتاب ابونعیم اصفہانی (430ھ) کی ''حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء'' کا اختصار ہے۔ابونعیم اصفہانی (430ھ) نے اپنی کتاب میں سیرت طیبہ ﷺ کا تذکرہ شامل نہیں کیا تھا۔چنانچہ ابن جوزی نے اس میں سیرت طیب ﷺ کا اضافہ کیا، نیز کتاب کو حشو وزوائد سے پاک کیا۔یہ کتاب روایتی اسلوب پر مبنی ہے۔اس میں روایات کی مکمل اسناد ذکر نہیں کی گئیں، تاہم سیرت طیبہ ﷺ کے سلسلے میں کتاب کو قابل اعتماد بنانے کے لیے مروی عنہ یعنی صحابی کا نام ذکر کیا ہے۔ صفة الصفوۃ کی تالیف میں ابن جوزی نے صحیحین، جامع ترمذی، مسند امام احمد اور واقدی کی المغازی سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔

تلقيح فهوم اهل الأثر في عيون التاريخ والسير

چوتھی اور آخری کتاب کا نام ''تلقيح فهوم أهل الأثر فی عيون التاريخ و السير'' ہے۔پہلے اس کتاب کا کچھ حصہ لندن سے تلقيح فهوم أهل الأثر في مختصر السير و الأخبار'' کے عنوان سے 1892ء میں طبع ہوا۔پھر مکمل کتاب دہلی سے موجودہ نام کے ساتھ 1916ء میں شائع ہوئی۔یہ تصنیف متعدد علوم وفنون کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔کتاب کی ابتدا میں ایک قابل ذکر حصہ سیرت طیبہ ﷺ پر مشتمل ہے، جو بڑی جامعیت اور اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترتیب دیا گیا ہے۔کتاب کا یہ حصہ الگ سے اردو زبان میں ''النبی الاطہر'' کے نام سے پبلش ہو چکا ہے۔

الوفاء بأحوال المصطفى کا اسلوب و منهج

امام ابن جوزی کی یہ چاروں کتب ہی سیرت طیبہ ﷺ کے سلسلے میں خاصی شہرت رکھتی ہیں، لیکن چوں کہ مولد النبی کا علی التعین کوئی مستند نسخہ ثابت نہیں ہے، اسی طرح صفة الصفوة اور تلقيح فهوم اهل الأثر في عيون المغازی و السير سیرت النبی ﷺ پر مستقل اور جامع کتب نہیں ہیں، اس لیے سر دست ہم صرف ''الوفا باحوال المصطفیٰ'' کے اسلوب ومنہج اور امتیازی خصوصیات کو موضوع بحث بنا رہے ہیں۔باقی کتب سے بحث اور تجزیاتی مطالعہ ایک مستقل عنوان کا متقاضی ہے جسے کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

الوفا بأحوال المصطفى کا سبب تالیف

انسان کی ہر علمی کاوش کا کوئی اہم مقصد اور سبب لازمی ہوتا ہے، جس کا ذکر عام طور پر کتاب کے مقدمے میں کیا جاتا ہے۔ابن جوزی کے پیش نظر بھی الوفاء کی تالیف کے چند ایک اہم اسباب اور مقاصد تھے۔ابن جوزی کا خیال تھا کہ عام لوگ نبی رحمت ﷺ کا محض سرسری سا تعارف رکھتے ہیں اور آپ ﷺ کی حقیقی شان اور فضیلت سے ناواقف ہیں۔اس لیے آپ نے پختہ عزم کرلیا کہ سیرت

پر ایک ایسا ذخیرہ مرتب کیا جائے، جس میں آپ ﷺ کے مقام ومنصب، مکمل حالات زندگی، ثبوت رسالت اور جملہ انبیاے کرام پر آپ ﷺ کی فضیات کو محکم دلائل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب کی تالیف کا مقصد درج ذیل الفاظ میں بیان کیا:

فإني رأيت خلقاً من أمتنا لا يحيطون علماً بحقيقة فضيلته فأحببت أن أجمع كتابا أشير فيه إلى مرتبته، و أشرح حاله من بدايته إلى نهايته، و أدرج في ذلك الأدلة على صحة رسالته و تقدمه على جميع الأنبياء في رتبته. (۸)

میں نے امت مسلمہ میں سے ایسے لوگوں کو دیکھا جو آپ ﷺ کی فضیلت (اور) حقیقت سے ناواقف ہیں۔ مجھے یہ بات بھلی معلوم ہوئی کہ ایک ایسی کتاب مرتب کروں جس میں آپ کا مقام مرتبہ بیان کروں۔ اول تا آخر آپ ﷺ کے سوانح واضح کروں۔ نیز ثبوت رسالت اور مرتبہ میں تمام انبیا پر تقدم پر ٹھوس دلائل درج کروں۔

چنانچہ ابن جوزی نے اس کتاب میں نبی رحمت ﷺ کی سیرت کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ ثبوت رسالت کے لیے دلائل جمع کئے ہیں اور جملہ انبیاے کرام پر آپ ﷺ کی فوقیت اور برتری کو ٹھوس دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن جوزی کی مذکورہ کتاب فن سیرت نگاری میں ایک نئی اختراع اور جدت پسندی ہے اور سیرت طیبہ ﷺ کے سلسلے میں ایسی کثیر الفوائد تصنیف اس سے پہلے منظر عام پر نہیں آئی، جو بیک وقت سیرت نبوی، دلائل نبوت، شواہد رسالت اور خصائص وغیرہ کو جامع ہو۔

> کتاب کی یہ خوبی سیرت النبی ﷺ پر لکھی گئی سابقہ کتب سیرت سے اسے ممتاز کر دیتی ہے۔ ابن جوزی نے مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کے استعمال سے اجتناب کیا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کی دقیق زبان استعمال کرنے سے بھی احتراز کیا ہے۔

اہم موضوعات

''الوفاء بأحوال المصطفیٰ''، محض سیرت رسول ﷺ سے بحث نہیں کرتی، جیسا کہ اس کے نام سے گمان ہونے لگتا ہے بلکہ، اس میں مصنف علام نے احوال سیرت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان اہم موضوعات اور مباحث کا بھی ذکر کیا ہے جن پر الگ الگ مستقل کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ نیز ابن جوزی سے پہلے سیرت نگاروں نے بھی ان میں سے کسی ایک پر ہی زیادہ فوکس کیا تھا۔ ابن جوزی کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے متعدد مضامین کو اپنی کتاب کا حصہ بنایا ہے۔ لہٰذا اگر اس مختصر مطالعے میں کتاب کے موضوعات کو الگ الگ تفصیلاً ذکر کرنا ممکن نہیں، چنانچہ اختصار کے پیش نظر کتاب کے جملہ مضامین کو چھے اہم موضوعات میں سمیٹنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

سیرۃ رسول عربی ﷺ

''الوفاء بأحوال المصطفیٰ'' کا اکثر حصہ نبی رحمت ﷺ کے سوانح سے متعلق ہے۔اس اہم موضوع کے تحت ابن جوزی نے آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے ولادت سے قبل کے واقعات کا ذکر کیا ہے اور پھر وفات تک کے تمام احوال زندگی کو مختصر مگر بڑی جامعیت سے بیان کیا ہے۔ابن جوزی نے اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ آں حضور ﷺ کی حیات مبارکہ کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔اسی لیے انھوں نے نبی رحمت ﷺ کا حلیہ مبارک، عبادات وکیفیت عبادت، عادات وسنن مبارکہ، ورع وتقوی، لباس، گھریلو سامان، سواریاں، غلام اور خدام، آرایش وزیبایش، پسندیدہ کھانے، مشروبات، استراحت کے آداب، ازدواجی زندگی، اسفار، غزوات اور مشاہدات کو تفصیلا بیان کیا ہے۔

شمائل رسول عربی ﷺ

ابن جوزی نے الوفا میں نبی رحمت ﷺ کے اخلاق اور عادات پر تفصیل سے لکھا ہے۔آپ ﷺ کی حسی اور معنوی صفات پر روشنی ڈالی ہے۔نیز حیات عامہ وخاصہ میں آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے سلوک، طرز عمل اور سنن کا تذکرہ بھی شامل ہے۔

خصائص رسول عربی ﷺ

ابن جوزی نے الوفا میں نبی رحمت ﷺ کے فضائل اور خصائص کبری پر تفصیل سے لکھا ہے۔انھوں نے خصوصیت سے آپ کے ان امتیازات کو کتاب کا حصہ بنایا ہے، جو اللہ تعالی نے صرف آپ ﷺ کو عطا فرمائے تھے اور جن کی بدولت اللہ جل شانہ نے نبی رحمت ﷺ کو جملہ انبیاے کرام علیہم الصلوۃ والتسلیم پر فضیلت اور برتری عطا فرمائی ہے۔

دلائل نبوت رسول عربی ﷺ

سیرت نگاروں نے اس موضوع پر مستقلا کتب تصنیف کی ہیں۔ابن جوزی نے اس ضمن میں نبی رحمت ﷺ کے حسی اور معنوی ہر دو طرح کے معجزات کو ''الوفاء'' میں جمع کیا ہے۔مصنف نے بڑے ہی مضبوط اور ٹھوس دلائل سے دعوائے نبوت میں نبی رحمت ﷺ کی سچائی کو ثابت کیا ہے اور اس پر وارد شدہ اہم اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے۔

تخصصات محمدی ﷺ

ابن جوزی کی ''الوفا'' میں نبی رحمت ﷺ کے ان اہم اور امتیازی مناصب کا تذکرہ بھی موجود ہے، جو خداوند قدوس نے خصوصی طور پر صرف آپؐ ہی کو عطا کیے ہیں، دیگر انبیاے کرام کو ان سے سرفراز نہیں کیا گیا۔مثلا مقام وسیلہ، شفاعت کبری، مقام محمود، لواء الحمد اور حوض کوثر کا عطا کیا جانا آپ کے خاص مناصب میں سے ہیں۔اسی طرح جنت میں اولین دخول، امت کی کثرت اور اعمال امت کی بارگاہ نبوی میں پیشی بھی نبی رحمت ﷺ کے ان امتیازی اوصاف میں شامل ہیں جنھیں ''الوفاء'' میں خاص اہمیت سے نقل کیا گیا ہے۔

ابواب درود و سلام

الوفا'' میں نبی رحمت ﷺ پر درود اور سلام پڑھنے کے سلسلے میں بھی کئی باب قائم کیے گئے ہیں، جن میں نبی رحمت ﷺ پر درود وسلام پڑھنے کی فضیلت، باری تعالیٰ اور ملائکہ کا آپ پر درود پڑھنا، کیفیت درود وسلام، منکرین درود شریف کے مذمت اور خواب میں نبی رحمت ﷺ کی زیارت کے متعلق عمدہ اور قیمتی مواد جمع کیا ہے۔

مذکورہ موضوعات پر ابن جوزی سے پہلے بھی یقیناً سیرت نگاروں نے بہت کچھ لکھا تھا لیکن عمومی طور پر متقدمین نے کسی ایک عنوان کو اپنی اپنی کتاب کا موضوع تحریر بنایا تھا۔ نیز اگر کسی نے ان سب پر لکھا بھی، تو اس قدر تفصیل اور جامعیت سے نہیں جتنا ''الوفاء'' میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلے ان تمام موضوعات کو ایک ہی کتاب میں حسن ترتیب، جامعیت اور تفصیل کے ساتھ زیور تحریر سے آراستہ کرنے کا امتیاز اور سہرا امام ابن جوزی ہی کے سر ہے۔

الوفا بأحوال المصطفی کے محاسن اور امتیازی خصوصیات

''الوفاء بأحوال المصطفیٰ'' کی نمایاں خوبی اس کا سلیس، سادہ، مختصر اور انتہائی عام فہم تحریری اسلوب ہے۔ کتاب کی یہ خوبی سیرت النبی ﷺ پر لکھی گئی سابقہ کتب سیرت سے اسے ممتاز کر دیتی ہے۔ ابن جوزی نے مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کے استعمال سے اجتناب کیا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کی دقیق زبان استعمال کرنے سے بھی احتراز کیا ہے۔ نیز ادب سیرت سے انتہائی دقیق اور عمیق نکات اخذ کر کے قاری کو بیجا کوفت اور الجھن میں نہیں ڈالا۔ لہذا عوام وخواص کے لیے اس کتاب سے استفادہ کرنا انتہائی آسان ہوگیا ہے۔

ابن جوزی نے ''الوفا'' میں اختصار کو ملحوظ رکھا ہے اور غیر ضروری تفاصیل کو نقل کرنے سے مکمل طور پر کنارہ کش رہے ہیں۔ قارئین کی اکتاہٹ کے پیش نظر اور کتاب کو مختصر کرنے کے لیے احادیث واخبار کی اسانید کو حذف کر دیا ہے۔ اسی طرح ایجاز کی خاطر اشعار کو بھی شاذ و نادر ہی کہیں ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کو غیر ضروری اقوال اور تکرار سے محفوظ رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نیز اگر کسی روایت کو مکرر بھی لائے ہیں تو ابھی الفاظ کے ساتھ نہیں بلکہ الفاظ اور معانی کے اضافہ کے ساتھ لائے ہیں۔

جامعیت ابن جوزی کی سیرت نگاری کا ایک اور نمایاں وصف ہے۔ ''الوفا بأحوال المصطفیٰ'' میں سیرت طیبہ ﷺ سے متعلق تمام پہلوؤں اور ضروری معلومات اور واقعات کو مرتب کر دیا گیا ہے۔

''الوفا'' حسن ترتیب اور وقت تالیف کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ مصنف نے جامع عناوین کے تحت ''الوفاء'' کو متعدد ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ان ابواب میں پھر مزید چھوٹے چھوٹے ذیلی ابواب قائم کئے ہیں۔ ہر ہر حدیث، بحث اور باب کو اس کے صحیح اور جائز مقام پر رکھا ہے۔ سیرت النبی سے متعلق واقعات اور معلومات کی ترتیب ایسی ہے کہ مبہمات اور ظاہری اختلافات خود بخود حل ہو جائیں، تاہم بعض اختلافی مقامات پر بے لاگ تبصرے بھی کیے ہیں اور متقدمین علمائے کرام کی آراء ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ جانب

راجح کو ترجیح دی ہے اور جانب مرجوح کی وجہ تردید و تنقیص بھی بیان کی ہے۔

الوفاء بأحوال المصطفی کے دیگر کتب پر اثرات

''الوفاء بأحوال المصطفیٰ'' کو اس کی حسن ترتیب، مستند اور سیرت النبی ﷺ سے متعلق تمام پہلوؤں کو جامع ہونے کی وجہ سے بے پناہ مقبولیت اور شہرت دوام حاصل ہوئی۔ بعد میں آنے والے سیرت نگاروں نے ان امور میں ابن جوزی کے نقش قدم پر چلنا اپنے لیے باعث افتخار سمجھا اور اپنی کتب سیرت کو تقریباً اسی انداز سے ترتیب دیا۔ لہٰذا ابن جوزی کے بعد لکھی جانے والی کتب سیرت میں اس فنی اور تکنیکی جدت کو واضح طور پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ علامہ سیوطی (911ھ) کی مشہور زمانہ تصنیف ''الخصائص الکبریٰ'' اس کی بہترین مثال ہے۔

الوفاء بأحوال المصطفی بطور ماخذ سیرت

الوفاء بأحوال المصطفیٰ کے بعد سیرت النبی ﷺ پر لکھنے والے متعدد مؤلفین نے ''الوفا'' کو براہ راست ایک ماخذ سیرت کی حیثیت سے لیا ہے اور اپنی کتب سیرت میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ چند ایک کتب کا تعارف زیب قرطاس ہے:

> الوفاء بأحوال المصطفیٰ سیرت طیبہ ﷺ کا ایک جامع اور مستند انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس میں نبی رحمت ﷺ کے احوال حیات، فضائل، شمائل نبوی، دلائل نبوت، شواہد رسالت، غزوات، معجزات اور مکاتیب وغیرہ پر تفصیلاً گفتگو کی گئی ہے۔

کشف اللغمة في معرفة الأئمة

ابو الحسن علی بن عیسی الاربلی (692ھ) کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں متعدد مقامات پر ''الوفاء بأحوال المصطفیٰ'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔

المواهب اللدنية

محمد بن احمد قسطلانی (923ھ) کی تالیف ہے۔ یہ کتاب سیرتی ادب کا بنیادی اور اہم مصدر تسلیم کی جاتی ہے۔

سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد

امام محمد الصالحہ (942ھ) کی تالیف ہے۔ سیرت النبی پر ایک ضخیم اور جامع کتاب ہے جو بارہ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

ضياء النبي ﷺ

محمد کرم شاہ الأزہری (1418ھ) کی تالیف ہے۔ سیرت طیبہ سے متعلق ایک جاندار اور تعصبات سے پاک، جامع کتاب ہے۔

الصفافي التوسل والتبرك بالمصطفى

ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تالیف ہے۔اس کتاب میں بھی ''الوفا بأحوال المصطفیٰ'' کو بطور ماخذ لیا گیا ہے۔

زیارت قبور

ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تالیف ہے۔اس کتاب میں بھی ''الوفا بأحوال المصطفیٰ'' کو بطور ماخذ لیا گیا ہے۔

عالم ارواح کا میثاق اور عظمت نبوی ﷺ

ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تالیف ہے۔اس کتاب میں بھی ''الوفاء بأحوال المصطفیٰ'' کو بطور ماخذ لیا گیا ہے۔ان کے علاوہ بھی عربی، اردو اور فارسی کی بہت سی بلند پایہ اور مشہور و معروف تصانیف اور تحریروں میں ''الوفاء بأحوال المصطفیٰ'' کو بطور ماخذ و مصدر لیا گیا ہے۔کتاب سے استفادہ کا رجحان اس کی مقبولیت کی واضح علامت ہے۔

امام ابن جوزی کا محدثانہ اسلوب و منہج

امام ابن جوزی ایک بلند پایہ محدث تھے۔آپ علم جرح و تعدیل سے بھی خوب واقفیت رکھتے تھے۔راجح اور مرجوح روایات پر بھی آپ کی گہری نظر تھی۔اسی بنا پر آپ نے سیرت نگاری میں بھی محدثانہ اسلوب و منہج اختیار کیا ہے۔انھوں نے نقل کو عقل پر ترجیح دینے کا راستہ اپنایا ہے۔نیز جہاں ضرورت ہو وہاں روایت کے ساتھ درایت سے بھی کام لیا ہے۔ہر باب میں احادیث بکثرت لائے ہیں۔نیز اپنی کتاب کی ابتدا اور انتہا دونوں ہی احادیث نقل کرنے سے کی ہیں۔تاہم اختصار کے پیش نظر روایات کی اسانید ذکر نہیں کیں بلکہ صرف صحابی یا تابعی کے نام پر اکتفا کیا ہے۔فن حدیث میں ماہر محدث کی حیثیت سے بعض جگہوں پر احادیث کی صحت و عدم صحت پر کلام کیا ہے اور بعض مقامات پر راجح و مرجوح کی تعیین کی ہے۔مصنف کے محدثانہ منہج کا مطالعہ اور تجزیہ چند عنوانات کے تحت پیش کیا جاتا ہے۔

روایت حدیث میں احتیاط

امام ابن جوزی نے کتاب کے مقدمے میں ہی یہ بات اپنے اوپر لازم کر لی تھی کہ وہ صحت حدیث کا خاص خیال رکھیں گے۔کثرت حدیث کے شوق میں ''حاطب اللیل'' کی مانند رطب و یابس کو جمع نہیں کریں گے۔صرف صحیح اور مستند احادیث کو اپنی کتاب میں شامل کریں گے:

> ولا اخلط الصحيح بالكذب كما يفعل من يقصد تكثير روايته، مثل حديث هامة بين الهيم، و زريب بن برثملي وما جاء في مجانستها اذ في الصحيح غنية لمن قضى الله بهدايته.(9)
>
> میں جھوٹی روایات کو صحیح روایات کے ساتھ خلط ملط نہیں کروں گا جیسا کہ کثرت روایت کے طالب ایسا کرتے ہیں۔مثلاً حدیث ھامۃ بین الھیم'' اور ''زریب بن برثملی وغیرہ۔کیوں کہ صحیح احادیث اس شخص کے لیے کافی ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ

نے ہدایت کا فیصلہ فرمادیا ہو۔

اگر موازنہ کیا جائے تو بلاشبہ مصنف متقدمین سیرت نگاروں کی نسبت اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ تاہم بعض مقامات پر کچھ ایسی روایات بھی ہیں جنھیں بعض محققین کمزور اور ضعیف بلکہ موضوع روایات میں شمار کرتے ہیں۔ مگر یہاں امکان یہ ہے کہ وہ روایات ابن جوزی کے نزدیک معتبر ہوں؟ امام ابن جوزی پر تساہل پسندی کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔ لیکن تحقیقی مطالعے سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ''الوفا'' میں ایسی متنازع روایات کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

بیان ضعف کے لیے بعض روایات کا اندراج

امام ابن جوزی نے صحت حدیث کا التزام کیا ہے، تاہم انھوں نے بعض ابواب میں قصداً بھی ضعیف احادیث کو نقل کیا ہے۔ ایسی روایات کو نقل کرنے سے مقصود کچھ ثابت کرنا نہیں ہوتا بلکہ جرح و نقد کرنا اور ضعف کی وجہ بیان کرنا ہوتا ہے یا کسی اعتراض وغیرہ کا جواب دینا ہوتا ہے۔ نیز ایسی روایات کو مستقل اور باب کے حصے کے طور پر نہیں بلکہ کسی سوال یا اعتراض کے ضمن میں یا مخفی سوال کے جواب کے طور پر ذکر کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے تبسم کو ثابت کرنے کے لیے متعدد روایات نقل کی ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ نبی کریم ﷺ سے قہقہہ کے ساتھ ہنسنا قطعاً ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا انھوں نے حضرت علی سے ثبوت قہقہہ والی ایک روایت نقل کرنے کے بعد جرح کی ہے:

وهذا الحديث لايثبت،فيه جماعة مجروحون، ولايصح عن رسول الله ﷺ،انه كان يزيد على التبسم.(10)

یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ اس کی سند میں مجروح راویوں کی ایک پوری جماعت ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ سے تبسم سے زیادہ صحت کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔

ان الفاظ میں ابن جوزی نے ثبوت ضحک والی روایت پر سخت جرح کی ہے۔ ان کے نزدیک اس روایت کے راوی ثقہ نہیں ہیں۔ انھوں نے اس کے گویا سب ہی رواۃ کو مجروح قرار دیا ہے۔ اس لیے ان کے مطابق یہ روایت ضعیف اور نا قابل استدلال ہے۔ اسی طرح ابن جوزی نے نبی کریم ﷺ کے فارسی کلمات کی ادائیگی کرنے سے متعلق دو احادیث ذکر کرنے کے بعد جرح کی ہے۔ ان کے مرفوع ہونے کا انکار کیا ہے۔(11) ایسی تنقید اور جرح کی متعدد مثالیں کتاب میں موجود ہیں۔

احادیث میں راجح اور مرجوح کی نشان دہی

احادیث میں راجح اور مرجوح کی نشان دہی ''الوفا بأحوال المصطفیٰ'' کی ایک اور اہم خوبی ہے، جو اسے سابقہ کتب سیرت سے ممتاز کرتی ہے۔ ابن جوزی نے اختلافی مقامات پر نہ تو چشم پوشی سے کام لیا ہے اور نہ ہی صرف متقدمین علمائے کرام کی آراذ کر کرنے پر اکتفا کیا ہے، بلکہ اس سے ایک قدم آگے جانب راجح کی تعیین بھی کی ہے اور جانب مرجوح کی وجہ تنقیص بھی بیان کی ہے۔ چنانچہ نبی

رحمت ﷺ نے انگوٹھی کسی ہاتھ میں پہنی؟ اس مضمون کی روایات مختلف فیہ ہیں۔ امام ابن جوزی کے مطابق نبی رحمت ﷺ کی سنت بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کی تھی۔ اس مضمون کی احادیث انھوں نے کتاب میں ذکر کیں ہیں نیز جس روایت میں دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کا ذکر ہے، اس کو مندرجہ ذیل الفاظ میں ضعیف قرار دیا ہے:

واختلفت الرواية هل كان يلبسه في يمينه، أو في يساره؟ عن جابر: أن النبي كان يتختم في يمينه. محمد بن عباد ضعيف وابن ميمون ليس بشيء. قال البخاري: هو ذاهب الحديث. واليسار أصح. (12)

اس بارے میں روایات میں اختلاف ہے کہ نبی رحمت ﷺ انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہنتے تھے یا بائیں ہاتھ میں؟ حضرت جابر نے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ مگر اس روایت میں محمد بن عباد ضعیف ہیں اور ابن مامون بھی کمزور راوی ہے۔ امام بخاری نے ان کو ذاہب الحدیث کہا ہے۔ اس لیے انگوٹھی بائیں ہاتھ میں پہننے والی روایت زیادہ صحیح ہے۔

ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ نبی رحمت ﷺ کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ راجح قول کے مطابق آپ ﷺ نے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنی تھی۔ ابن جوزی اسی مضمون کی روایت کو راجح قرار دے رہے ہیں۔ نیز باب میں روایت صرف جانب راجح کی ذکر کی ہے، جانب مرجوح کی روایت نقل کر کے تضعیف بیان کی ہے اور اس کے رواۃ پر جرح کی ہے۔ نیز جانب راجح کی نشان دہی "والیسار أصح" کے الفاظ سے کی ہے۔ نیز اس مسئلہ میں جمہور کی رائے بھی یہی ہے۔

اسی طرح ابن جوزی نے واقعہ معراج سے متعلق ایک طویل روایت ذکر کی ہے جو حضرت انس سے مروی ہے۔ اس حدیث کے دو طرق ہیں۔ پہلی روایت کے راوی شریک ہیں، جس کے مطابق نبی رحمت ﷺ پر پچاس (50) نمازوں کی فرضیت ہوئی تو آپ ﷺ تخفیف کی درخواست لے کر بار بار اللہ تعالیٰ کے پاس واپس جاتے رہے۔ ہر بار دس دس نمازیں معاف ہوتی رہیں حتی کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔ یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں نے نقل کی ہے۔ حضرت انس سے دوسری روایت ثابت کے واسطہ سے نقل کی گئی ہے، جس کے مطابق ہر بار پانچ نمازوں کی تخفیف ہوتی رہی حتی کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔ اس روایت کو نقل کرنے میں امام مسلم (817-875ء) منفرد ہیں۔ ابن جوزی نے ان دونوں روایات پر درج ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا:

"وقد ذكرنا في حديث أنس بن مالك، من رواية شريك عنه، وفي رواية حماد بن سلمة، عن ثابت، عن أنس أنه قال: رَجَعْتُ إِلَى رَبِّي فَحَطَّ عَنِّي خَمْساً ولَم أَزَلْ أَرَاجِعُ بَينَ رَبِّي وَبَيْنَ مُوسَى وَيَحُطُّ عَنِّي خَمْساً خمساً وهذا من أفراد مسلم، والأول أصح؛ لأنه قد اتفق البخاري ومسلم من حديث أنس بن مالك، ومن حديث أنس عن نفسه أنه حط عشراً، فهذه الرواية التي فيها فَحَطَّ خَمْساً خَمْساً غلط من الراوي. (13)

ہم نے انس بن مالک سے روایت شریک کے واسطہ سے ذکر کی ہے اور دوسری روایت حماد بن سلمہ نے ثابت سے کی ہے۔ ان کے مطابق حضرت انس نے آپ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ "میں اپنے رب کی طرف لوٹ کر گیا تو مجھ سے پانچ نمازیں

معاف کی گئیں۔ پھر میں اپنے رب اور موسیٰ کے درمیان آتا جاتا رہا اور اللہ پانچ پانچ نمازیں کم کرتا رہا۔ امام مسلم اس روایت میں منفرد ہیں۔ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اس پر بخاری اور مسلم دونوں متفق ہیں نیز حضرت انس کی دوسری روایت میں دس دس معاف کرنے کا ذکر ہے۔ لہٰذا جس روایت میں پانچ پانچ کی معافی کا ذکر ہے وہ راوی کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔

اس پیراگراف میں ابن جوزی نے حضرت انس کی ایک سند سے منقول روایت کو درست قرار دیا ہے، جب کہ دوسری سند سے منقول اسی روایت کو راوی کی بھول چوک اور غلط فہمی پر مبنی قرار دیا ہے۔ اس طرح انھوں نے پہلی سند سے منقول روایت کو ترجیح دی ہے۔

تطابق اور توافق کی کوشش

ابن جوزی نے کتاب میں جہاں مختلف فیہ روایات ذکر کی ہیں، وہاں اگر ممکن ہو روایات کے درمیان جمع و تطبیق کی بھی کامیاب سعی کی ہے۔ چنانچہ نبی رحمت ﷺ کے خضاب کے حوالے سے حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ مہندی اور وسمہ کا خضاب استعمال کرتے تھے۔ پھر ابن عمر سے نقل کیا گیا: آپ ﷺ نے زعفران اور ارس (یمن میں پایا جانے والا ایک پودا ہے جس سے زرد رنگ حاصل ہوتا ہے) کا خضاب استعمال فرمایا۔ ابن جوزی نے اس اختلاف کی درج ذیل توجیہ پیش کی ہے:

فإن قيل: فما وجه الاختلاف؟ قلنا: قد كان يخضب بهذا تارة وبهذا تارة. (14)

اگر ان روایات میں اختلاف کی وجہ پوچھی جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ اختلاف مختلف حالات کی وجہ سے ہے۔ کبھی یہ خضاب استعمال فرماتے اور کبھی دوسرا استعمال فرماتے۔

گویا ابن جوزی نے ان دونوں روایات میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے کہ اگرچہ بادی النظر میں ان روایات میں باہم اختلاف محسوس ہو رہا ہے لیکن درحقیقت ان میں کوئی اختلاف اور تضاد نہیں ہے کیوں کہ دونوں طرح کی روایات مختلف اوقات اور احوال سے متعلق ہیں۔

رواۃ حدیث پر جرح اور ائمہ کے اقوال

فن جرح و تعدیل علم حدیث سے متعلق ایک اہم شعبہ ہے۔ ابن جوزی نے محدث ہونے کی حیثیت سے حدیث کی سند میں آنے والے رواۃ پر جرح بھی کی ہے اور بعض کی تعدیل بھی کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے خود بھی تنقید کی ہے اور ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ چنانچہ باب ''في ذكر خضاب'' میں ایک سوال کے تحت دو روایات نقل کی ہیں۔ پہلی روایت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے اور جابر بن عبداللہ سے۔ ان دو روایات کو ذکر کرنے کے بعد ان کی سند میں مذکور راویوں پر جرح کی ہے:

وأما حديث سعد، وجابر: فراويهما الواقدي، وقد كذبه أحمد، وقال يحيى: ليس بثقة. وقال أبو زرعة: كان

يضع الحديث.(15)

جہاں تک حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث کا معاملہ ہے تو ان کا راوی واقدی ہے۔امام احمد نے اسے جھوٹا کہا ہے۔امام یحییٰ نے فرمایا کہ وہ ثقہ نہیں ہے۔امام ابوزرعہ فرماتے ہیں وہ احادیث گھڑا کرتا تھا۔

یہاں ابن جوزی محدثانہ انداز کو خوب کام میں لائے ہیں۔انھوں نے حدیث کو اس بنا پر ضعیف قرار دیا ہے کہ حدیث کی سند میں موجود ایک راوی مجروح ہے۔راوی پر جرح ثابت کرنے کے لیے ابن جوزی نے ائمہ حدیث کے اقوال سے بھی مدد لی ہے۔

معارض روایات کا جواب

ابن جوزی ہر باب میں اپنے موقف کی تائید میں معتبر احادیث لائے ہیں۔تاہم اگر ان کے معارض بھی کوئی حدیث موجود ہو تو اسے سوال کے انداز میں ذکر کرنے کے بعد جواب بھی دیا ہے۔مثلاً نبی رحمت ﷺ خضاب استعمال کرتے تھے یا نہیں؟ اس بارے میں روایات مختلف ہیں۔ابن جوزی کے نزدیک خضاب استعمال فرمانا راجح ہے۔اس پر انھوں نے معتبر احادیث نقل کیں ہیں۔اس کے بعد سوال کے انداز میں معارض حدیث نقل کرنے کے بعد جواب دیتے ہیں:

فإن قيل: قد روي أنه لم يخضب عن ثابت قال: سئل أنس عن خضاب رسول الله ﷺ؟ فقال: لم يخضب. عن زياد مولى سعد قال: سألت سعد بن أبي وقاص هل خضب رسول الله ﷺ؟ قال: لا. عن بشير مولى المازنيين قال: سألت جابر بن عبد الله هل خضب رسول الله ﷺ؟ قال: لا... فالجواب: أما حديث أنس فجوابه من وجهين: أحدهما: أنه قد اختلفت الرواية عنه. عن أنس قال: إن رسول الله ﷺ كان يمسه بصفرة. والثاني: أن قوله. لم يخضب «شهادة على نفي، وقد قطع غيره من الصحابة. والإثبات مقدم على النفي... وأما حديث سعد، وجابر: فراويهما الواقدي، وقد كذبه أحمد.(16)

اگر سوال کیا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب لگایا ہی نہیں۔جیسے حضرت ثابت سے منقول ہے کہ حضرت انس سے نبی کریم ﷺ کے خضاب کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا آپ ﷺ نے خضاب استعمال نہیں فرمایا۔حضرت سعد کے آزاد کردہ غلام زیاد سے روایت ہے کہ انھوں نے سعد بن ابی وقاص سے پوچھا: کیا نبی کریم ﷺ خضاب لگاتے تھے؟ تو انھوں نے فرمایا نہیں۔۔۔مازنیین کے آزاد کردہ غلام بشیر سے منقول ہے انھوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے سوال کیا کہ کیا نبی کریم ﷺ لگاتے تھے انھوں نے فرمایا نہیں۔۔۔اس کے دو جواب ہیں۔اول حضرت انس سے مختلف روایات منقول ہیں۔ان میں سے ایک روایت میں ہے کہ آپ ان کو زرد رنگ کرتے تھے۔دوسرا لم یخضب نفی پر شہادت ہے جب کہ دیگر صحابہ نے یقین کا اظہار کیا ہے۔اور اثبات کو نفی پر تقدم حاصل ہے۔نیز سعد اور جابر کی روایات کا راوی واقدی ہے، جسے امام احمد نے جھوٹا کہا ہے۔

اس پیرا گراف میں ابن جوزی نے اپنے موقف کے معارض روایات کے بارے میں فرمایا ہے کہ حضرت انس نے نفی خضاب کے بارے میں گمان کا اظہار کیا ہے، جب کہ دیگر صحابہ کرام نے قطعی طور پر خضاب کا اثبات کیا ہے۔ نیز ضابطہ ہے کہ اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ حضرت سعد اور حضرت جابر کی روایات اس لیے معتبر نہیں ہیں کہ ان کا راوی واقدی ہے، جسے بعض محدثین نے جھوٹا کہا ہے۔

بعض روایات و استدلالات پر نقد

الوفاء بأحوال المصطفیٰ" بعض روایات ایسی ہیں جن پر بعض لوگوں نے تنقید کی اور انھیں ضعیف و موضوع قرار دیا ہے، تاہم جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، انھوں نے ہوسکتا ہے انھیں اپنی تحقیق میں درست سمجھا ہو۔ البتہ چوں کہ اس نوع کی روایات پر جرح و نقد موجود ہے، لہٰذا ہم یہاں چند روایات کی نشان دہی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حضرت مسیح کو حضور ﷺ پر ایمان لانے کی تاکید سے متعلق روایت

ایک روایت جس پر نقد کیا جاتا ہے حضرت مسیح کو حضور ﷺ پر ایمان لانے کی تاکید سے متعلق ہے۔ یہ روایت کچھ اس طرح نقل کی گئی ہے:

> عن ابن عباس قال: أوحى الله تعالى إلى عيسى عليه السلام فيما أوحى إليه: أن صدق بمحمد و مر أمتك من أدركه منهم أن يؤمنوا به، فلولا محمد ما خلقت آدم، ولولا محمد ما خلقت الجنة والنار، ولقد خلقت العرش فاضطرب فكتبت عليه لا إله إلا الله محمد رسول الله فسكن. (17)
>
> ابن عباس نے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو وحی کی کہ محمد ﷺ پر ایمان لائے۔ اپنی امت کو تاکید کیجیے کہ جو بھی انھیں پائے وہ ان پر ایمان لائے۔ اگر محمد ﷺ کو (نبی) نہ بنانا ہوتا تو میں آدم کو پیدا ہی نہ کرتا۔ اگر محمد ﷺ کا وجود نہ ہوتا تو میں جنت اور دوزخ پیدا نہ کرتا۔ اور میں نے عرش پیدا کیا تو وہ کانپنے لگا۔ میں نے اس پر "لا إله إلا الله محمد رسول الله" لکھا تو وہ پرسکون ہوگیا۔

یہ روایت اس کے علاوہ کچھ دیگر الفاظ سے بھی نقل کی گئی ہے۔ تاہم الفاظ کے فرق کے باوجود تمام کا مفہوم اور مقصد ایک ہی ہے۔ کسی روایت میں ایک انداز اختیار کیا گیا ہے تو دوسری روایت میں وہی بات ذرا مختلف الفاظ میں منقول ہے۔ نیز ایک روایت میں اختصار ہے تو دوسری میں تفصیل ہے یا اس میں کوئی زائد بات نقل کی گئی ہے۔ لیکن ان تمام روایات میں مدار سند یعنی حدیث نقل کرنے والے صحابی حضرت عبد اللہ بن عباس ہیں۔ ابن جوزی نے مذکورہ روایت کو پہلے باب "في ذكر التنويه بذكر نبينا محمد ﷺ من زمن آدم علیہ السلام" میں بھی نقل کیا ہے۔ تاہم فرق اتنا ہے کہ وہاں پر جملے کسی قدر کم نقل کیا گیا ہے۔ یعنی روایت کو ذکر کرنے میں اختصار سے کام لیا ہے۔ وہ روایت درج ذیل ہے:

عن ابن عباس: أوحى الله تعالى إلى عيسى عليه السلام: لولا محمد ما خلقت آدم، ولقد خلقت العرش فاضطرب، فكتبت عليه لا إله إلا الله محمد رسول الله فسكن. (18)

ابن عباس سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو وحی کی کہ اگر محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں آدم کو پیدا نہ کرتا۔ اور میں نے عرش کو پیدا کیا تو وہ کانپنے لگا۔ میں نے اس پر "لا إله إلا الله محمد رسول الله" لکھا تو اسے قرار آ گیا۔

یہ حدیث یا اس مضمون کی دیگر احادیث کو بعض محققین نے ضعیف اور موضوع قرار دیا ہے۔ اس پر ایک نقد یہ کیا گیا ہے کہ اس کا راوی عمرو بن اوس الانصاری محدثین کے نزدیک مجہول الحال ہے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے:

عمرو بن اوس يجهل حاله، اتى بخبر منكر - اخرجه الحاكم في مستدركه، واظنه موضوعا من طريق جندل بن والق. (19)

عمرو بن اوس راوی مجہول الحال ہے۔ اس نے ایک منکر روایت بیان کی ہے جسے امام حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے۔ میں (امام ذہبی) سمجھتا ہوں کہ یہ روایت جندل بن والق کے طریق سے موضوع ہے۔

لیکن، جیسا کہ ذہبی کے مندرجہ بالا الفاظ سے ظاہر ہے، امام حاکم نے اسے اپنی مستدرک میں نقل کیا ہے۔ اور مستدرک حاکم صحیحین کی شرائط کے مطابق ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو کسی سیرت نگار کے لیے اس حدیث کے تناظر میں اس سے صرف نظر آسان نہیں، کہ یہ ایک معتبر کتاب حدیث میں منقول ہے۔ امام حاکم نے اس روایت کو ان الفاظ سے نقل کیا ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: أوحى الله إلى عيسى عليه السلام. يا عيسى آمن بمحمد، وأمر من أدركه من أمتك أن يؤمنوا به، فلولا محمد ما خلقت آدم، ولولا محمد ما خلقت الجنة والنار، ولقد خلقت العرش على الماء فاضطرب فكتبت عليه لا إله إلا الله محمد رسول الله فسكن. (20)

ابن عباس نے روایت کیا ہے کہ اللہ نے حضرت عیسیٰ پر وحی نازل کی کہ اے عیسیٰ: ایمان لائیے محمد ﷺ پر اور اپنی امت کو تاکید کیجیے کہ جو بھی انھیں پائے وہ ان پر ایمان لائے۔ اگر محمد ﷺ کا وجود نہ ہوتا تو میں آدم کی تخلیق نہ کرتا۔ اگر محمد ﷺ کا وجود نہ ہوتا تو میں جنت و دوزخ کو پیدا نہ کرتا۔ میں نے عرش کی تخلیق پانی پر کی تو وہ کانپنے لگا۔ میں نے اس پر "لا إله إلا الله محمد رسول الله" لکھا تو اسے قرار آ گیا۔

امام حاکم کی اس روایت میں ابن جوزی کی روایت کے اعتبار سے کسی جگہ الفاظ کا اضافہ، کہیں کچھ کمی اور ایک جگہ پر جملہ کی ترتیب میں معمولی سی تبدیلی ہے، لیکن اس کے باوجود معنی و مفہوم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ نیز اس کے راوی بھی ابن عباس ہی ہیں، جس سے روایت کا ایک ہونا ثابت ہوتا ہے۔ البتہ اس کے نقل کرنے میں رواۃ سے الفاظ میں معمولی تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔

امام حاکم کے مطابق یہ روایت صحیحین کی شرط پر اور صحیح الاسناد ہے۔ امام صاحب کے الفاظ ہیں:

هذه حديث صحيح الاسناد و لم يخرجاه-(21)

اس حدیث کی سند صحیح ہے لیکن امام بخاری اور امام مسلم نے اسے نقل نہیں کیا۔

البتہ، جیسا کہ اوپر وضاحت ہوئی بعض دیگر لوگوں نے امام حاکم کی تصحیح پر نقد کیا ہے اور ان کی بعض احادیث کو جھوٹی اور موضوع قرار دیا ہے، مثلاً ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

و قالوا: ان الحاكم يصحح أحاديث و هي موضوعة مكذوبة عند أهل المعرفة بالحديث، ----و لهذا كان أهل العلم بالحديث لا يعتمدون على مجرد تصحيح الحاكم-(22)

اور (محدثین) کہتے ہیں کہ امام حاکم احادیث کو صحیح قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ حدیث کی معرفت رکھنے والوں کے ہاں موضوع اور جھوٹی ہوتی ہیں۔۔۔اور اسی وجہ سے حدیث کا علم رکھنے والے محض امام حاکم کی تصحیح پر اعتماد نہیں کرتے۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ امام تیمیہ جہاں امام حاکم کی بعض روایات کو جھوٹی قرار دیتے ہیں وہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی اکثر احادیث صحیح ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں:

كان غالب ما يصححه فهو صحيح.(23)

ان کی اکثر تصحیح شدہ احادیث صحیح ہیں۔

بہر حال مذکورہ حدیث ان احادیث میں سے ہے، جن کی صحت پر علما میں اختلاف ہے، بعض نے اسے صحیح اور بعض نے موضوع قرار دیا ہے۔

اللہ کے عرش پر کلمے سے متعلق روایت

الوفاء کی زیر نظر نوعیت کی روایات میں سے ایک حضرت آدم کے واقعے سے متعلق ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ حضرت آدم نے اللہ کے عرش پر "لا اله إلا الله مُحَمَّدٌ رسول الله" لکھا ہوا دیکھا تھا۔ جب آدم سے غلطی ہوئی تو اسی نام کے وسیلے سے معافی چاہی تو انھیں معافی مل گئی۔ روایت کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: لَمَّا أَصَابَ آدم الخَطِيئَةَ، رَفَعَ رَأْسَهُ فَقَال: رَبِّ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ إِلَّا غَفَرْتَ لِي، فَأَوْحَى اللَّهُ تَعَالَى إِلَيه: وَمَا مُحَمَّدُ، وَمَنْ مُحَمَّدُ؟ فقال: رَبِّ إِنَّك لَمَّا أَتْمَمْتَ خَلْقِي رَفَعْتُ رَأْسِي إِلَى عَرْشِك، فَإِذا عَلَيه مَكْتُوبٌ لا اله إلا الله مُحَمَّدٌ رَسُولُ الله. فَعَلِمْتُ أَنَّهُ أَكْرَمُ خَلْقِك عَلَيْك، إِذ قَرَنْتَ اسْمَهُ مع اسْمِك، قال: نَعَمْ قَدْ غَفَرْتُ لَك، وَهُوَ آخِرُ الأَنْبِيَاءِ من ذُرِّيَّتِك، وَلَوْ لاهُ مَا خَلَقْتُك.(24)

عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب آدم سے خطا ہوگئی، تو انھوں نے سر اٹھا کر دعا کی: پروردگار محمد کے حق کے وسیلے مجھے معاف کر دیجیے۔ اللہ نے ان کی طرف وحی کی، محمد کون ہیں؟ انھوں نے کہا: جب آپ نے میری تخلیق

مکمل کی تو میں نے سر اٹھا کر آپ کے عرش کی طرف دیکھا۔اس پر لکھا ہوا تھا: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، محمد اللہ کے رسول ہیں۔مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ آپ کے نزدیک مخلوق میں سب سے زیادہ معزز ہیں۔اسی لیے آپ نے ان کا نام اپنے نام کے ساتھ ملایا ہے۔اللہ نے فرمایا: تم ٹھیک کہتے ہو۔میں نے تمھاری بخشش کر دی۔وہ آخری نبی ہیں اور آپ کی اولاد میں سے ہیں۔اگر وہ نہ ہوتے تو میں تجھے پیدا ہی نہ کرتا۔

اس روایت کو ابن جوزی کے علاوہ چند دیگر محدثین نے بھی نقل کیا ہے، تاہم الفاظ میں معمولی اختلاف بھی ہے اور یہ چیز احادیث میں عام ہوتی ہے۔تمام روایات کے مفہوم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر یہ ایک ہی روایت ہے جسے راویوں نے مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔امام حاکم کے یہاں یہ الفاظ ملتے ہیں:

عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: لما اقترف آدم الخطيئة قال: يا رَبِّ اسالك بِحَقِّ مُحَمَّدٍ لما غَفَرْتَ لي. فقال الله: يا آدم و كيف عرفت محمدا و لم اخلقه؟ قال: يا رب، لانك لما خلقتني بيدك و نفخت في من روحك رفعت راسي فرايت على قوائم العرش مكتوبا لا اله الا الله محمد رسول الله فعلمت انك لم تصف الى اسمك الا احب الخلق اليك، فقال الله صدقت يا آدم، انه لاحب الخلق التي ادعني بحقه فقد غفرت لك و لو لا محمد ما خلقتك-"(25)

امام طبرانی نے بھی اس روایت کو کسی قدر الفاظ کے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔ (26)

اس روایت پر بھی بعض محدثین کے استدلالات کی روشنی میں نقد کیا گیا اور اسے موضوع قرار دیا گیا ہے۔اس ضمن میں بعض استدلالات تو نہایت عجیب ہیں اور نقد کو الٹا کمزور کرنے والے ہیں مثلاً کہا گیا ہے کہ امام حاکم نے اس روایت پر صحت کا حکم کسی قدر بے اطمینانی کی کیفیت میں لگایا ہے۔(27)

حضور ﷺ کے سلام بھیجنے سے متعلق روایت

مذکورہ نوعیت کی احادیث میں سے ایک "حدیث القطف" ہے۔حضرت انس سے مروی اس روایت کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

جاء جبريل إلى النبي ﷺ فقال: إن الله يقرئك السلام، و أرسلني إليك بهذا القطف، فاخذه ﷺ (28)

جبرئیل نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف لائے اور کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو سلام پیش کر رہے ہیں۔آپ کی طرف یہ گچھا بھیجا ہے، تو آپ ﷺ نے اسے لے لیا۔

اس روایت پر بعض محدثین نے وضع کا حکم لگایا ہے۔امام سیوطی نے ابن حبان کے حوالے سے اس روایت کو بے اصل قرار دیا ہے۔اس کی وجہ روایت میں موجود ایک راوی حفص ہے، جسے ناقابل احتجاج قرار دیا گیا ہے۔(29) اس روایت کے حوالے سے ابن جوزی کے ہاں یہ تضاد ملتا ہے کہ انھوں نے خود بھی اس روایت پر وضع کا حکم لگایا اور اسے الموضوعات میں ذکر کیا ہے۔اگر یہ

حدیث ابن جوزی کے نزدیک موضوع تھی تو یہاں اسے کس لیے نقل کیا گیا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

حضور ﷺ کے پاکیزہ سے پاکیزہ صلب میں منتقل ہونے سے متعلق روایت

اسی طرح ابن جوزی نے ابن عباس سے ایک اور روایت ذکر کی ہے، جس میں نبی رحمت ﷺ کے پاکیزہ نسب اور پاک صلب سے پاکیزہ صلب کی جانب منتقل ہونے کا ذکر ہے۔ اس روایت کو کسی قدر الفاظ کی کمی یا بیشی کے ساتھ دیگر محدثین نے بھی نقل کیا ہے۔ روایت کے جو الفاظ ابن جوزی نے نقل کیے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

عن ابن عباس قال: قلت: يا رسول الله، أين كنت وآدم في الجنة؟ قال: كُنتُ في صلبه، وأُهْبِطَ إلى الأَرْضِ وَأنا في صُلْبِهِ، وَرَكِبْتُ السَّفِينَةَ فِي صلب أبي نوح، وقُذِفْتُ في النَّارِ في صُلب أبي إبْرَاهِيم، لم يَلْتَقِ لِي أَبَوَانِ قط على سفاح، لم يَزَلْ يَنْقُلُني من الأَصْلابِ الطَّاهِرَةِ إلى الأَرْحَامِ النَّقِيَّةِ مُهَذَّبًا لَا تَتَشَعْبُ شُعْبَتَانِ إلا كُنْتُ فِي خَيْرِهما، أَخَذَ اللهُ لِي بِالنُّبوَّةِ مِيثَاقِي، وفي التَّوْرَاةِ بَشَّرَ بِي، وفي الإِنْجِيلِ شَهَرَ اسْمِي، تُشْرِقُ الْأَرْضُ لِوَجْهِي والسَّماءُ لِرُؤْيَتِي. (30)

ابن عباس راوی ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ جب آدم جنت میں تھے تو آپ اس وقت کہاں تھے؟ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں ان کی پشت میں تھا۔ آدم کو زمین پر اتارا گیا تب بھی میں ان کی پشت میں تھا۔ میں اپنے والد نوح کی پشت میں ہی کشتی پر سوار ہوا۔ مجھے میرے والد ابراہیم کی پشت میں ہی آگ میں پھینکا گیا۔ میرے آباؤ اجداد کبھی بھی زنا کے مرتکب نہیں ہوئے۔ میں ہمیشہ پاکیزہ پشتوں سے صاف رحموں کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ میں ہمیشہ دو جماعتوں میں سے بہتر جماعت میں رہا۔ اللہ نے میری نبوت کے لیے (انبیاء) سے عہد لیا۔ تورات میں میری بشارت دی گئی۔ انجیل میں میرے نام کی تشہیر کی گئی۔ زمین میرے چہرے کی وجہ سے روشن اور آسمان میرے دیدار سے منور ہے۔

اس حدیث کی الوفاء میں موجودگی کے حوالے سے بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ابن جوزی کے ہاں الموضوعات میں بھی یہ درج ہے۔ اگر یہ موضوع ہے تو اسے الوفاء میں کیوں نقل کیا گیا اس پر مزید حیرت اس سے ہوتی ہے کہ الموضوعات'' میں ابن جوزی نے اس روایت کو قصہ گو واعظوں کی تخلیق قرار دیا ہے، جسے ایک محکم سند کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔ (31)

اسرائیلیات کے حوالے سے نقد

بعض لوگوں کے مطابق ابن جوزی نے اپنی کتاب میں چند ایک ایسی روایات بھی ذکر کیں ہیں جو ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ اسرائیلیات (32) کے قبیل سے بھی ہیں۔ مثلاً حضرت کعب الاحبار (33) سے مروی درج ذیل روایت:

لما أراد الله تعالى أن يخلق محمداً أمر جبريل عليه السلام أن يأتيه فأتاه بالقبضة البيضاء التي هي موضع قبر رسول الله، فعجنت بماء التسنيم ثم غمست في أنهار الجنة وطيف بها في السموات والأرض، فعرفت الملائكة محمداً

وفضله قبل أن تعرف آدم، ثم كان نور محمد ﷺ يُرى في غرة جبهة آدم وقيل له يا آدم هذا سيد ولدك من الأنبياء والمرسلين. فلما حملت حواء بشيت انتقل عن آدم إلى حواء، وكانت تلد في كل بطن ولدين إلا شيئاً، فإنها ولدته وحده، كرامة لمحمد. ثم لم يزل ينتقل من طاهر إلى طاهر إلى أن ولد. (34)

اس روایت میں نبی رحمت ﷺ کی تخلیق کے مراحل اور فضیلت کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس روایت میں آپ ﷺ کے پاکیزہ نسب کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اسی نوعیت کی اوپر والی حدیث کی طرح اس روایت پر بھی محدثین نے کلام کیا ہے اور اسے اسرائیلیات میں شمار کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے۔ (35)

بہرحال جہاں تک ضعیف روایات کی توجیہ کا تعلق ہے تو چند ایک ائمہ (مثلاً امام حاکم) نے ایسی احادیث کی توثیق بھی کی ہے۔ ہوسکتا ہے ابن جوزی بھی یہی رائے رکھتے ہوں۔ (36)

واقدی کے اقوال سے اخذ اور مرویات کا رد

واقدی شروع سے ہی مختلف فیہ راوی رہے ہیں۔ محدثین نے ان پر سخت جرح اور نقد کیا ہے۔ تاہم بعض نے ان کو ثقہ بھی قرار دیا ہے۔ ابن جوزی نے واقدی سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ تاہم ابن جوزی نے جہاں واقدی (207ھ) کے اقوال نقل کئے ہیں، تو ان پر کوئی نقد نہیں کیا۔ البتہ احادیث کی سند میں جہاں واقدی کا ذکر آیا ہے تو اسے کمزور راوی قرار دیا ہے۔ بلکہ اپنی کتاب ''الضعفاء والمتروکین'' میں محدثین کے حوالے نقل کرکے واقدی پر سخت جرح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

قال احمد بن حنبل: هو كذاب ..... وقال يحي: ليس بثقة، وقال مرة: ليس بشيء لا يكتب حديثه، وقال البخاري والرازي والنسائي: متروك الحديث، وذكر الرازي والنسائي انه كان يضع الحديث، وقال الدار قطني: فيه ضعف. (37)

احمد بن حنبل نے فرمایا کہ وہ جھوٹا ہے۔۔۔ یحییٰ بن معین نے انھیں ثقہ بتایا ہے۔ ایک دفعہ کہا کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے اس سے احادیث نہ لکھی جائیں۔ امام بخاری، امام رازی اور امام نسائی متروک الحدیث قرار دیتے ہیں۔ رازی اور نسائی نے ذکر کیا ہے وہ احادیث گھڑتا تھا۔ دارقطنی کے مطابق ان میں ضعف ہے۔

ابن جوزی نے اسی شدید جرح کی بنا پر واقدی کی تضعیف کی ہے اور ان کی مرویات پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے مرجوح یا ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن اگر تحقیق کی جائے تو یہاں ایک طرح کا تضاد بھی نظر آتا ہے۔ کیوں کہ ابن جوزی نے واقدی کے اقوال تو بغیر کسی رد وقدح کے قبول کئے ہیں البتہ ان سے مروی روایات کو قبول نہیں کیا۔ تاہم ان کی جانب سے یہ عذر بھی پیش کیا جاسکتا ہے کہ مسلم اسکالرز نے بالعموم واقدی کو تاریخ اور سیر میں ثقہ جب کہ حدیث میں متروک اور ضعیف کہا ہے۔ ابن جوزی نے اسی بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے واقدی سے تاریخ اور سیرت کے بیان میں اخذ کیا ہے جب کہ ان کی روایات کے بارے محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔

خلاصہ بحث

مسلم اسکالرز نے سیرت نگاری کے سلسلہ میں مختلف اسالیب اور مناہج اختیار کئے ہیں۔ابن جوزی نے اس حوالے سے محدثانہ منہج اپنایا ہے۔زیر مطالعہ مضمون میں ان کے اسلوب کا تفصیلی جائزہ لینے اور تجزیہ کرنے کے بعد درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں:

الوفاء بأحوال المصطفیٰ سیرت طیبہ ﷺ کا ایک جامع اور مستند انسائیکلو پیڈیا ہے۔اس میں نبی رحمت ﷺ کے احوال حیات، فضائل، شمائل نبوی، دلائل نبوت، شواہد رسالت، غزوات، معجزات اور مکاتیب وغیرہ پر تفصیلاً گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب اپنے اسلوب اور ترتیب میں بہت عمدہ ہے، غیر ضروری اور بے فائدہ کلام سے پاک ہے۔

الوفا میں سیرت نگاری کا محدثانہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔صرف مستند اور صحیح روایات کو کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے

ابن جوزی نے روایات پر راجح و مرجوح، صحیح و ضعیف اور رواۃ حدیث پر جرح و تعدیل کے اعتبار سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

بظاہر متعارض احادیث میں تطابق و توافق کی سعی کی ہے۔

بعض مقامات پر روایات سیرت پر کیے گئے سوالات اور اعتراضات کا ذکر کیا ہے اور ان کا محاکمہ کیا ہے۔

الوفا کے تمام تر محاسن اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کے نقائص بی بیان کیے گئے ہیں کہ مولف نے اپنی کتاب میں بعض ضعیف، موضوع روایات نقل کی ہیں۔

ابن جوزی نے واقدی کے اقوال کو قبول کیا ہے لیکن ان سے روایت نہیں کیا، بلکہ روایت کے سلسلہ میں انھیں متروک الحدیث اور وضاع قرار دیا ہے۔فی الجملہ ابن جوزی کی کتاب الوفاء محدثانہ اسلوب میں سیرت النبی ﷺ پر ایک جامع، مستند اور عمدہ کتاب ہے۔

حوالہ جات

3 شمس الدین س الدین محمد بن احمد ذہبی، تاریخ الاسلام و وفیات المشاہیر و الاعلام (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2005ء)، 12/463۔

ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی ابن جوزی، المنتظم فی تاریخ الملوک والامم (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1992ء)، 10/251

5 شمس الدین محمد بن احمد ذہبی، سیر اعلام النبلاء (بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، 1985)، 21/383۔

6 ابو الفرج عبد الرحمن بن علی ابن جوزی، صید الخاطر (بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۹۹۲ء)،

215-214۔

7مصطفی عبدالواحد، مقدمۃ التحقیق الوفاء بأحوال المصطفیٰ، از ابن جوزی (فیصل آباد: المکتبۃ النوریۃ الرضویۃ، 1977ء)، 1/م۔

8ابوالفرج عبدالرحمن بن الجوزی، الوفاء باحوال المصطفی (ریاض: الوسیۃ السعیدیۃ، 1776ء)، 1/21۔

9ابن جوزی، الوفاء، 1/1

10ابن جوزی، الوفاء، 2/131

11ابن جوزی، الوفاء، 2/123

12ابن جوزی، الوفاء، 2/279

13ابن جوزی، الوفاء، 2/357

14ابن جوزی، الوفاء، 2/281

115ابن جوزی، الوفاء، 2/282

16ابن جوزی، الوفاء، 2/282-283

17ابن جوزی، الوفاء، 1/107

18ابن جوزی، الوفاء، 1/69

19ابو عبداللہ محمد بن احمد الذہبی (بیروت: دار المعرفۃ)، 3/246

20ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین (بیروت: دار الکتیب العلمیۃ، 2002ء)، 2/672

21 حاکم نیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین، 2/672-

22شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ، مجموع الفتاوی (المدینۃ المنورۃ: مجمع الملک فھد لطباعۃ المصحف الشریف، 2004ء)، 1/255

23 شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ، مجموع الفتاوی، 1/255

24ابن جوزی، الوفاء، 1/68

25 حاکم نیشاپوری، المستدرک، 2/672-

26ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی، المعجم الاوسط (قاہرہ: دارالحرمین، 1995ء)، 6/313-314-

27دیکھیے حاکم نیشاپوری، المستدرک، 2/672، مذکورہ حدیث پر امام حاکم کی گفت گو۔

20ابن جوزی، الوفاء، 2/25-

29 جلال الدین عبدالرحمن سیوطی، اللالي المصنوعة في الاحاديث الموضوعه (بیروت: دارالمعرفہ، 2010)، 1/276

30 ابن جوزی، الوفاء 1/70، 71

21 ابوالفرج عبدالرحمن بن علی بن الجوزی، الموضوعات (ریاض: مکتبۃ الرشد، 1998ء)، 85-

2 محدثین کے ہاں اسرائیلیات کو علی الاطلاق قبول کیا جاتا ہے اور نہ ہی مطلقا انھیں رد کیا جاتا ہے۔ البتہ قرآن وحدیث یا ان سے مستنبط اسلامی اصولوں کی روشنی میں انھیں پرکھا جاتا ہے۔

33 ان کا نام کعب بن مانع حمیری، کنیت ابو اسحاق اور لقب کعب الاحبار تھا۔ یمن میں یہود کے بہت بڑے عالم تھے۔ عہد فاروقی میں اسلام قبول کیا۔ مخضرمین میں سے ہیں اور تابعین کے طبقہ اولیٰ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اکثر اسرائیلیات انہی سے مروی ہیں۔ جمہور محدثین نے ان کی توثیق کی ہے البتہ بعض نے ضعیف بھی قرار دیا ہے۔ دیکھیے: رجال تفسیر الطبری، موسوعہ رجال کتب التسعہ-

2 ابن جوزی، الوفاء 1/70

35 محمد بن عبدالباقی زرقانی، شرح الزرقانی علی المواهب اللدنیه (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، 1996ء)، 1/83-

36 اس لیے کہ بعض روایات کے بعض علما کے یہاں ضعیف قرار دیے جانے اور اس نقد کو قابل اعتنا سمجھنے کے باوصف محدثین کا ایک گروہ فضائل کے باب میں ایسی روایات کو نقل کرنا جائز سمجھتا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ابن جوزی نے بھی اسی رائے کو اختیار کرتے ہوئے ایسی روایات کو شامل کتاب کیا ہو۔

37 ابو الفرج عبد الرحمن بن علی بن الجوزی، الضعفاء والمتروکین (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، 1986ء)، 3/87-88

عظیم محدث علامہ شیخ محمد سعید حسرت عظیم آبادی

مفتی محمد خالد حسین نیموی قاسمی

برصغیر کی علمی تاریخ میں ہندستان کا شمالی شہر عظیم آباد (پٹنہ) کا نام بڑی قدر ومنزلت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہ شہر ایک طویل عرصے تک علومِ دینیہ، حدیث وتفسیر، فقہ وکلام، معقولات ومنقولات اور تصوف وسلوک کے اربابِ کمال کا مرکز رہا ہے۔ اسی علمی ماحول نے متعدد ایسے رجالِ علم پیدا کیے، جنھوں نے ہندستان کے علمی افق سے نکل کر حرمین شریفین تک اپنی علمی نسبتیں قائم کیں اور اسنادِ حدیث کے اس مقدس سلسلے کو آگے بڑھایا جو امتِ محمدیہ کا ایک امتیازی علمی سرمایہ ہے۔

> شیخ محمد سعید عظیم آبادی کی زندگی کو سامنے رکھا جائے تو ان کی شخصیت کے کئی پہلو ایک دوسرے میں پیوست دکھائی دیتے ہیں۔ وہ عظیم آباد کے فرزند تھے، مگر ان کا علمی سفر انھیں کانپور، دہلی، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تک لے گیا۔ وہ حنفی فقیہ تھے، مگر ان کا علمی افق صرف فقہ تک محدود نہ تھا۔ بلکہ فقیہ ہونے کے ساتھ وہ محدث و مسند تھے، حدیث ان کے نزدیک محض روایت نہ تھی بلکہ ایک امانت تھی۔ وہ صاحبِ طریقت تھے، لیکن اعلیٰ درجہ کے متبع سنت تھے۔ طریقت ان کے ہاں شریعت وعلم سے الگ کوئی مستقل راستہ نہ تھی۔

انھی اہلِ علم میں ایک جلیل القدر شخصیت شیخ محمد سعید حسرت بن واعظ علی بن عمر دراز جعفری طیاری عظیم آبادی کی ہے۔ بڑے بڑے محدثین نے انھیں نہایت جامع القاب سے یاد کیا ہے۔ شیخ احمد عطار مکی نے آپ کے لیے: ”الشیخ المعمر، البرکۃ، عالی الاسناد، امین اللہ علی العباد، المحدث المسند، العارف الصفی، ولی اللہ تعالیٰ“۔ جیسے بھاری بھرکم القاب استعمال کیے ہیں۔

شیخ محمد بن سعید بن واعظ علی عظیم آبادی۔ سرزمین بہار سے تعلق رکھنے والے عظیم ترین محدث ہیں۔ آپ مشائخ حدیث میں بھی بلند و بالا مقام رکھتے ہیں اور مشائخ طریقت میں بھی مسلم الثبوت ہیں۔ آپ کا فیض ہندستان سے لے حجاز مقدس تک پھیلا اور عرب وعجم میں آپ کی اسانید کے ساتھ آپ کی روحانی نسبت بھی عام ہوئیں۔

آپ کے حلقۂ تلمذ میں علامہ محسن بن یحییٰ ترہتی، علامہ عبد الستار بن عبد الوھاب مہاجر مکی، علامہ احمد عطار مکی اور علامہ ظہیر احسن شوق

نیموی جیسے محدثین شامل ہیں۔علامہ محسن بن یحییٰ ترہتی مہاجر مدنی کے اساتذہ میں آپ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔علم حدیث کی جستجو میں علامہ ترہتی سب سے پہلے علامہ سعید حسرت عظیم آبادی کی خدمت میں پہنچے۔انھوں نے ہی آپ کو کانپور حضرت مولانا سلامت اللہ صدیقی بدایونی کی خدمت میں بھیجا۔

عظیم آباد (پٹنہ) بیگو سرائے کا پڑوسی ضلع اور بہار کا دارالسلطنت ہے۔اس کی نسبت اورنگ زیب کے پوتے عظیم الشان کی طرف ہے۔جب شہزادہ عظیم الشان ۱۷۰۳ء میں صوبہ بہار کے گورنر بنے،تو انھوں نے اس شہر کا نام عظیم آباد رکھا۔فی الحال یہ شہر پٹنہ کے نام سے مشہور ہے۔(تاریخ صوبہ بہار از علی محمد شاد عظیم آبادی)

حضرت شیخ محمد بن سعید حسرت بڑے محدث ہونے کے ساتھ عظیم صاحب نسبت بافیض بزرگ اور طریقت کے امام بھی ہیں۔وہ عظیم آباد کے سب سے زیادہ شہرت رکھنے والے علما میں سے ہیں۔اس کے علاوہ آپ صاحب دیوان شاعر بھی تھے،حسرت تخلص تھا۔شعر وادب میں ایک زمانے میں آپ کا ڈنکا بجتا تھا۔

آپ کے شاگرد شیخ احمد عطار مکی نے اپنی کتاب "النفح المسکی" میں سات صفحات پر مشتمل ان کا مفصل اور انتہائی والہانہ تذکرہ کیا ہے۔افسوس کہ اب تک یہ مبارک کتاب مخطوطہ کی شکل میں ہے۔

اسی طرح شیخ عبدالستار مہاجر مکی نے "فیض الملک الوھاب المتعالی في ذکر انباء القرن الثالث عشر و التوالی" میں تذکرہ نمبر ۱۴۱۸ کے تحت تین صفحات میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔اسی طرح علامہ عبدالحی حسنی نے نزھۃ الخواطر میں آپ کا مختصر تذکرہ کیا ہے،لیکن تمام تر عظمتوں کے باوجود آپ کا تعارف پردۂ خفا میں ہے،ضرورت ہے کہ ان کی عظمت کو بھرپور انداز میں اجاگر کیا جائے۔

علامہ محمد سعید عظیم آبادی کی پوری زندگی علم،اسناد،تدریس،سلوک اور صحبتِ اہلِ علم کا حسین امتزاج تھی۔ان کی شخصیت میں محدث کی جلالت،مدرس کا وقار،مسند کی امانت،صوفی کی صفا اور ایک صاحبِ نسبت بزرگ کی روحانی کیفیت یکجا نظر آتی ہے۔

ولادت اور ابتدائی علمی زندگی

شیخ محمد سعید کی ولادت عظیم آباد میں ہفتہ کے روز 27/ذی القعدہ 1232ھ کو ہوئی۔ان کی نشو ونما بھی اسی شہر میں ہوئی،جو اس زمانے میں ہندستان کا ایک معروف علمی مرکز تھا۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم اور دیگر اہلِ علم سے حاصل کی۔ابتدائی درسی کتابوں کے ساتھ فارسی طرزِ تحریر اور خوش نویسی بھی اپنے والد ہی سے سیکھی۔یوں ان کی علمی زندگی کی بنیاد گھر کے اسی علمی ماحول میں رکھی گئی جس میں تعلیم،تہذیب،کتاب اور اہلِ علم کی صحبت ایک دوسرے سے جدا نہ تھے۔

ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد ان کے اندر حصولِ علم کی پیاس مزید بڑھتی گئی،چنانچہ وہ اپنے وطن سے نکل کر کانپور پہنچے،

جہاں اس دور کے جلیل القدر عالم شیخ علامہ سلامت اللہ صدیقی بدایونی، کانپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہی مرحلہ ان کی علمی زندگی کا ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔

شیخ سلامت اللہ کانپوری کی علمی صحبت

شیخ محمد سعید نے شیخ سلامت اللہ کانپوری سے معقولات اور منقولات کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ ان کی علمی استعداد اور طلبِ علم سے متاثر ہو کر شیخ سلامت اللہ نے انھیں ایک طویل اجازت نامہ بھی تحریر کر کے دیا تھا، جس کی تعبیر آپ کے شاگرد شیخ احمد عطار مکی نے "نحوَ کرّاسة" سے کیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ صرف آپ کا اجازت نامہ اور اسانید کا تذکرہ ایک مکمل کاپی یا رجسٹر کے برابر تھا۔ جو افسوس کہ بعد میں ضائع ہوگیا۔ تاہم شیخ محمد سعید حسرت عظیم آبادی کی اپنی بعض تحریرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان سے درسی نصاب کی بیشتر اہم کتابیں پڑھی تھیں۔

شیخ محمد سعید حسرت خود اپنے علمی سفر کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> و کان ابتداء اشتغالي لديه في شرح السيد الزاهد على الرسالة القطبية من حاشية الفاضل غلام يحيى البهاري
>
> یعنی ان کے یہاں باقاعدہ علمی اشتغال کا آغاز شرحِ سید زاہد علی بر رسالۂ قطبی سے ہوا، جس پر مولانا غلام یحییٰ بہاری کی حاشیہ بھی شامل تھی۔

اپنے علمی سلسلۂ اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

> و كان أستاذي تلميذ مولانا مدن الشاهجهانفوري، وهو تلميذ مولانا باب الله الجونفوري۔ (النفح المسكى مخطوطه)

اس طرح ان کی علمی نسبت ایک ایسے سلسلے سے جا ملتی ہے جس میں ہندستان کے ممتاز اہلِ علم ایک دوسرے سے فیض حاصل کرتے چلے آئے تھے۔ شیخ باب اللہ جونپوری خود مولانا حمد اللہ صدیقی سندیلوی کے شاگرد تھے، جو درسی اور معقولات کی متعدد کتابوں پر اپنے مشہور شروح وحواشی کے سبب علمی حلقوں میں معروف تھے۔

حدیثی سند کا حصول

شیخ محمد سعید کی شخصیت کا سب سے روشن پہلو ان کا علمِ حدیث اور اسنادِ حدیث سے گہرا تعلق ہے۔ انھوں نے حدیث محض کتابوں سے نہیں پڑھی، بلکہ محدثین کے سامنے سماع، قراءت اور اجازت کے ذریعے اس علم کی اس زندہ روایت سے وابستہ ہوئے، جو استاد سے شاگرد تک تمام انوار و برکات کے ساتھ منتقل ہوتی ہے۔

حضرت عظیم آبادی نے اپنے شیخ سلامت اللہ کانپوری سے أربعینِ مسلسل بالأشراف کا بیشتر حصہ سماع کیا۔ آپ کی سند کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے علامہ احمد عطار مکی لکھتے ہیں:

وسمع المترجم من شيخه الشيخ سلامة الله المذكور الأربعين المسلسلة بالإشراف، في غالبها، برواية لها سماعاً من لفظ الشيخ عبد العزيز الدهلوي، سماعاً على أبيه الشيخ ولي الله الدهلوي، بقراءة الشيخ جار الله المكي اللاهوري، عن أبي طالب السندي، رحمه الله تعالى۔ (النفح المسكي مخطوطه)

یہ سند ہندستانی حدیثی روایت کی ایک نہایت اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں علامہ محمد سعید کے شیخ سلامت اللہ کانپوری، ان سے اوپر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی، پھر ان کے والد شاہ ولی اللہ دہلوی، پھر شیخ جاراللہ مکی لاہوری اور بالآخر شیخ ابوطالب سندی کا ذکر آتا ہے۔

اس سند کی معنویت صرف ناموں کے ایک سلسلے میں نہیں، بلکہ اس زندہ علمی روایت میں ہر شخص اپنے وقت کا امام ہے۔ اور ہزاروں علماء کا شیخ ہے۔

> شیخ محمد سعید کی علمی زندگی کا ایک اہم باب ان کا سفرِ حرمین ہے۔ 1263ھ میں وہ حج کی غرض سے مکہ مکرمہ پہنچے۔ لیکن ان کا یہ سفر صرف فریضۂ حج کی ادائیگی اور زیارتِ حرمین تک محدود نہ تھا، بلکہ انھوں نے اسے علم حدیث، اسناد، فیوض مشائخ اور صحبتِ اکابر کے حصول کا بھی ذریعہ بنایا۔

قادری مجددی نسبت

علم ظاہر کے ساتھ شیخ محمد سعید حسرت عظیم آبادی نے علمِ باطن اور تزکیۂ نفس کی راہ بھی اختیار کی۔ انھوں نے قادری مجددی سلسلہ کی نسبت شیخ شاہ نذر محمد کانپوری سے حاصل کی۔

حضرت شاہ نذر محمد نے یہ نسبت امام المجاہدین حضرت سید احمد شہید بریلوی سے حاصل کی تھی۔ حضرت سید احمد شہید اپنے عہد کے عظیم مصلح، مجاہد اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ ان کے ذریعے پورے برصغیر میں ایمان کی بادِ بہاری چلی اور شہداء کے اس قافلہ کے ذریعے قرونِ اولی کی یاد تازہ ہوگئی۔

اس طرح شیخ محمد سعید حسرت عظیم آبادی کی شخصیت میں علمِ حدیث اور سلوک وطریقت کی دو عظیم روایتیں جمع ہوگئیں۔ وہ ایک طرف اسنادِ حدیث کے حامل محدث تھے، تو دوسری طرف قادری مجددی سلسلے کے صاحبِ نسبت وصاحبِ سجادہ بزرگ بھی۔

تدریس وافادہ

جب شیخ محمد سعید نے اپنے اساتذہ سے علمی استفادہ مکمل کیا اور انھیں تدریس وافادہ کی اجازت حاصل ہوگئی تو وہ عظیم آباد واپس آئے اور وہیں درس وتدریس اور افادۂ عام میں مصروف ہوگئے۔

ان کے یہاں علم کے ساتھ عمل، تقویٰ، تہذیب اور تزکیہ بھی لازم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مجلس میں کتاب اور سند کے ساتھ صحبت اور تربیت کو بھی اہم مقام حاصل تھا۔ اپنے اساتذہ ومشائخ کی ان کے دل میں بڑی عظمت اور وقعت تھی۔ اپنے مشائخ کے سامنے اپنے کو ہیچ سمجھتے تھے۔

جب علامہ محسن ترہتی حاضر خدمت ہوئے!

ان کی شہرت جب دور دور تک پہنچی تو طلبۂ علم مختلف علاقوں سے ان کی خدمت میں آنے لگے۔ ان کے علمی مقام اور احترام مشائخ کے جذبے کا اندازہ اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ بعد میں معروف عالم دین عظیم محدث حضرت علامہ شیخ محسن بن یحییٰ بکری ترہتی (وطن خضر چک، ضلع بیگوسرائے) بھی ان سے استفادہ کے لیے آئے۔ تاہم شیخ محمد سعید نے اپنے استاد شیخ سلامت اللہ کانپوری کی موجودگی میں ادباً انھیں باقاعدہ پڑھانے سے گریز کیا اور اپنے استاد اور شیخ حضرت مولانا سلامت اللہ کانپوری کی طرف رہنمائی کی۔ البتہ تبرکاً انھوں نے شیخ محمد سعید سے معقولات ومنقولات کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ یہ واقعہ ان کے علمی مقام کے ساتھ استاذ اور شیخ کے تئیں اعلیٰ عقیدت اور احترام وادب کا بھی روشن ثبوت ہے۔

حرمین شریفین کا علمی سفر

شیخ محمد سعید کی علمی زندگی کا ایک اہم باب ان کا سفرِ حرمین ہے۔ 1263ھ میں وہ حج کی غرض سے مکہ مکرمہ پہنچے لیکن ان کا یہ سفر صرف فریضۂ حج کی ادائیگی اور زیارتِ حرمین تک محدود نہ تھا، بلکہ انھوں نے اسے علم حدیث، اسناد، فیوض مشائخ اور صحبتِ اکابر کے حصول کا بھی ذریعہ بنایا۔

مکہ مکرمہ میں ان کی ملاقات عظیم محدث اور صاحب نسبت بزرگ سید محمد بن علی سنوسی حسن الخطابی الادریسی المغربی سے ہوئی، جو جبل ابی قبیس میں مقیم تھے اور وہاں ان کی ایک خانقاہ اور زاویہ بھی تھی۔

شیخ محمد سعید نے ان سے حدیثِ مسلسل بالاولیہ سماع کی، حدیث کی ابتدائی کتابوں میں سے جزء شیخ محمد سعید سنبل ان کے سامنے پڑھا اور ان سے اجازت حاصل کی۔

یہاں علمی سند کے ساتھ روحانی نسبت کا ایک اور دروازہ بھی کھلا۔ سید سنوسی نے ان سے مصافحہ کیا، معانقہ فرمایا، خرقہ پہنایا، ذکر کی تلقین کی، تسبیح عطا کی اور بہت ساری نایاب کتبِ حدیث بھی اجازت کے ساتھ عنایت فرمائیں۔ ان کتابوں کی فہرست کو شیخ احمد عطار مکی نے نام کے ساتھ ذکر کیا ہے جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔

سید محمد بن علی سنوسی کی جامع اجازت

شیخ محمد سعید کی علمی عظمت کا سب سے اہم دستاویزی ثبوت عظیم محدث اور شیخ طریقت سید محمد بن علی سنوسی کی وہ جامع اجازت ہے جو انھوں نے شیخ محمد سعید کو عطا کی۔

اس کے ابتدائی الفاظ ہی میں ان کے علمی مقام کی گواہی موجود ہے:

فقد طلب مني الإجازة من تمكّن في علا الفضل وحازه الألمعي الإمام واللوذعي الهمام الولي الأديب والفهامة الأديب مولانا الشيخ محمد سعيد بن واعظ علي الهندي العظيم آبادي، بجميع مالي وعني ماثبت لدي روايته وتحققت عندي درايته من معقول ومنقول وفروع وأصول، سيما علم التفسير والحديث وآلاتهما المعروفة في القديم والحديث وغيرهما من سائر العلوم الإسلامية۔

شیخ محمد سعید بن واعظ علی ہندی عظیم آبادی، جو فضل وکمال کی بلندیوں پر فائز، ذکاوت وذہانت میں ممتاز، صاحبِ ولایت، ادیب اور فاضل عالم ہیں، نے مجھ سے ان تمام علوم میں اجازت طلب کی جو میرے پاس روایتاً و درایتاً ثابت ہیں۔ خواہ وہ معقولات ہوں یا منقولات، اصول ہوں یا فروع، بالخصوص علمِ تفسیر وحدیث اور ان کے متعلقہ علوم، نیز دیگر تمام اسلامی علوم۔

> شیخ محمد سعید عظیم آبادی کی حیات دراصل ایک ایسے دور کی علمی داستان ہے جب علم ابھی محض مطبوعہ کتابوں کا نام نہیں تھا۔ سند زندہ تھی، استاد زندہ تھا، سماع زندہ تھا، اجازت زندہ تھی اور علم کے ساتھ صحبت وتربیت کا ایک مکمل نظام زندہ تھا۔

پھر سید سنوسی لکھتے ہیں:

فأجبته لما اقترح، وبالامتثال والفرح، بعد أن سمع مني الحديث المسلسل بالأولية، وصافحته وشابكته، وألبسته الخرقة، ولقنته الذكر، وناولته السبحة، وناولته عدة وافرة من كتب الحديث وفهارس شيوخنا وشيوخهم، مناولة مقرونة بالإجازة۔ (النفح المسكي مخطوطه)

یہ الفاظ نہایت عظیم ہیں۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شیخ اپنے شاگرد کو اتنے عالی القاب وآداب سے یاد کرے۔ اس میں محض اجازتِ روایت کا ذکر نہیں بلکہ سماعِ حدیث، مصافحہ، معانقہ، خرقہ، تلقین ذکر، تسبیح اور کتبِ حدیث کی مناولت سب ایک ساتھ مذکور ہیں۔

گویا شیخ محمد سعید نے سید سنوسی سے علوم حدیث کی سند بھی پائی اور روحانی نسبت بھی حاصل کی۔

اجازت کے اختتام پر سید سنوسی لکھتے ہیں:

قال ذلك بلسانه، ورقمه ببنانه، الفقير إلى ربه، السيد محمد بن علي بن السنوسي الحسن الخطابي الإدريسي، غفر الله ذنبه وستر عيبه بمنه وكرمه، آمين۔ (النفح المسكي۔ مخطوطه)

یہ اجازت نامہ شیخ محمد سعید کی زندگی کا ایک نہایت قیمتی علمی سرمایہ ہے، کیوں کہ اس میں ان کی شخصیت کی علمی حیثیت، ان کے حاصل کردہ علوم اور ان سے قائم ہونے والی حدیثی و روحانی نسبت، تینوں کی بیک وقت شہادت موجود ہے۔

مدینہ منورہ میں استفادہ

مکہ مکرمہ کے بعد شیخ محمد سعید مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ وہاں انھوں نے محدث شمس محمد بن احمد العطوشی المغربی الطرابلسی المدنی سے استفادہ کیا۔

انھوں نے امام مالک کی موطأ (روایتِ یحییٰ بن یحییٰ) کتاب الزکاۃ تک ان کے سامنے پڑھی۔ محدث عطوشی نے ان کے لیے اپنے ہاتھ سے ایک نفیس اجازت نامہ تحریر کیا اور اس پر اپنی مہر بھی ثبت فرمائی۔

اسی طرح انھوں نے مدینہ منورہ کے بڑے عالم اور مدرس شیخ عبدالغنی دمیاطی سے بھی اجازت حاصل کی، جو شیخ محمد بن محمد الامیر الکبیر مصری کے تلامذہ میں سے تھے۔

مدینہ منورہ ہی میں انھوں نے دلائل الخیرات مکمل طور پر روضۂ مطہرہ میں سید محمد بن عبدالرحمن المغربی ثم المدنی کے سامنے پڑھا، جو اس کتاب کے معروف شیخ تھے۔ اور شیخ الدلائل کے نام سے شہرت رکھتے تھے۔

یوں سفرِ حرمین نے ان کی علمی شخصیت کو ہندستانی اسانید و روحانی سلاسل کی نہر سے نکال کر حجاز کے وسیع حدیثی سلسلے کے سمندر سے مربوط کر دیا۔

شیخ محمد سعید کی اجازتِ عامہ

شیخ محمد سعید خود بھی سند و اجازت کی اس روایت کو آگے منتقل کرنے کے لیے نہایت حساس تھے۔ ان کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا اجازت نامہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ علمِ حدیث کو ایک عظیم امانت سمجھتے تھے۔

وہ لکھتے ہیں:

إن علم الحديث أرفع العلوم شأناً وأعظمها إيقاناً وإتقاناً، وعلماؤها ما زالوا مكرمين بين الأنام ممتازين على سائر الفضلاء الكرام۔ (النفح المسكي۔ مخطوطه)

یعنی علمِ حدیث تمام علوم میں سب سے بلند مرتبہ اور یقین و اتقان کے اعتبار سے عظیم ترین علوم میں سے ہے، اور اس کے علما ہمیشہ لوگوں کے درمیان معزز اور ممتاز رہے ہیں۔

پھر وہ اہلِ حدیث کے مقام کو بیان کرتے ہوئے یہ معروف شعر نقل کرتے ہیں:

أهل الحديث هم أهل النبي وإن
لم يصحبوا نفسه أنفاسه صحبوا

اس کے بعد وہ سند کی ضرورت اور اس کے اہتمام کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اپنے ان مشائخ کا ذکر کرتے ہیں، جن سے انھیں اجازت حاصل ہوئی تھی، جن میں محمد سلامت اللہ کانپوری، شیخ محمد العطوشی، سید محمد سنوسی اور شیخ عبد الغنی دمیاطی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

پھر وہ صاحب اجازت علامہ احمد عطار مکی کو اپنی تمام مرویات، مقروءات، مسموعات اور مجازات کی عام، کامل اور تام اجازت عطا کرتے ہیں۔

یہاں ان کا یہ جملہ نہایت اہم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور صاحب اجازت کو تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیزوں پر عمل کی وصیت کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سند کا مقصد صرف روایت کے سلسلے کو محفوظ رکھنا نہیں تھا، بلکہ علم کو عمل، تقویٰ اور خشیت کے ساتھ آگے منتقل کرنا اس کا اصل مقصد تھا۔

> شیخ محمد سعید عظیم آبادی اسی مقدس زنجیر کی ایک معتبر اور روشن کڑی تھے۔ آپ عظیم آباد کے افق پر طلوع ہونے والے وہ ستارہ تھے، جن کی تابانی عجم سے عرب تک پہنچی۔ آپ کی شخصیت میں علم کی جلالت، حدیث کی امانت، سند کی پاس داری، طریقت کی نسبت اور عمل و تقویٰ کی روح یکجا ہوگئی تھی۔

آخری ملاقات: علم سے روحانیت تک

شیخ محمد سعید کی زندگی کے آخری ایام کا ایک واقعہ نہایت اثر انگیز ہے۔ النفح المسکی کے مصنف علامہ احمد عطار مکی ان کی خدمت میں آخری مرتبہ ان کی وفات سے چند ماہ قبل حاضر ہوئے۔ شیخ نے ان سے مصافحہ و معانقہ کیا، مبارک تسبیح عطا فرمائی اور اپنی سفید عمامہ، جسے وہ خرقۂ شریفہ کے طور پر عطا کرتے تھے، اپنے دست مبارک سے ان کے سر پر باندھی۔

شیخ احمد عطار مکی نے عرض کیا کہ جس طرح آپ نے اپنے شیخ سید سنوسی سے ذکر کی تلقین حاصل کی تھی، اسی طرح مجھے بھی ذکر کی تلقین فرما دیں۔

شیخ نے اپنی علالت طبع کی وجہ سے اس درخواست کو مؤخر کر دیا لیکن نمازِ جمعہ کے بعد جب مصنف دوبارہ حاضر ہوئے تو بیماری شدت اختیار کر چکی تھی۔ شیخ نے فرمایا:

> ”اگر اللہ تعالیٰ مجھے عافیت دے اور مہلت عطا فرمائے تو تمہیں ذکر کی تلقین کروں گا، لیکن اس وقت میری حالت ایسی نہیں، میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔“

چند روز بعد پھر حاضری ہوئی تو مرض مزید بڑھ چکا تھا۔شیخ نے معذرت کی اور فرمایا کہ اب وہ تلقین کی قدرت نہیں رکھتے۔
یوں شیخ احمد عطار مکی علامہ محمد سعید سے اس روحانی تلقین کے حصول سے محروم رہ گئے۔لیکن یہ محرومی بھی تقدیر کے ایک دوسرے دروازے کا پیش خیمہ تھی، کیوں کہ بعد میں انھیں مکہ مکرمہ میں ایسے شخص سے ملاقات نصیب ہوئی جو سید سنوسی کی صحبت میں رہ چکا تھا اور ان سے ذکر کی تلقین حاصل کر چکا تھا۔

وفات

شیخ محمد سعید حسرت عظیم آبادی 4/شعبان 1304ھ کو اس دارِفانی سے رخصت ہو گئے۔ان کی وفات محض ایک بڑا سانحہ تھی، ان کا وصال درحقیقت ہندستانی حدیثی روایت کی ایک اہم کڑی کا انقطاع تھا۔ان کے سینے میں ہندستان کے مدارس کی علمی روایت، حرمین کے محدثین کی اسناد، قادری مجددی نسبت اور اکابر کی صحبت کا ایک عظیم سرمایہ جمع تھا۔آپ پٹنہ سیٹی کے محلہ مغلپورہ میں دفن ہیں۔
حافظ سید شاہ نذرالرحمن عرف حفیظ عظیم آبادی آپ کے جانشین ہوئے۔اولاً محمد سعید حسرت عظیم آبادی نے اپنے چھوٹے بھائی جناب حمید صاحب کے صاحبزادے کو اپنا جانشین قرار دیا تھا مگر وہ رحلت فرما گئے۔نذرالرحمن صاحب انھیں حمید صاحب کے نواسہ تھے۔سعید صاحب کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔حضرت یحییٰ ابوالعلائی قاضی محمد اسماعیل قدیمی (قاضی عبدالودود کے دادا کے دادا) ممتاز شاگردوں میں ہیں۔انھوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔غالب شکن یاس یگانہ چنگیزی نے اسی مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی۔

خوابِ نبوی اور خلافت

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ شیخ محمد سعید حسرت عظیم آبادی نے اپنے بھانجے کے پوتے سید نذرالرحمن بن منجل حسین رضوی کو خانقاہ میں سجادہ نشین بنایا اور انھیں خلافت سے سرفراز فرمایا تھا۔
ان کی وفات کے بعد سید نذرالرحمن حج کے لیے مکہ مکرمہ آئے۔انھوں نے شیخ احمد عطار مکی کو بتایا کہ شیخ محمد سعید نے نبی کریم ﷺ کی مدح میں فارسی زبان میں ایک قصیدہ کہا تھا، جس میں ایرانی شاعر کاشانی کے قصیدے پر رد کیا گیا تھا۔قصیدہ مکمل کرنے کے بعد انھیں خواب میں نبی کریم ﷺ کی زیارت ہوئی۔آپ ﷺ نہایت خوش اور مسرور تھے اور آپ ﷺ نے ان سے محبت کے ساتھ مصافحہ فرمایا۔صبح ہونے پر انھوں نے یہ خواب اپنے خلیفہ کو سنایا۔خلیفہ نے عقیدت سے ان کا ہاتھ چوما۔
مصنف نے جب یہ واقعہ مسجد حرام میں سید نذرالرحمن سے سنا تو سلسلۂ نسبت کے احترام اور اس کے تسلسل کی حفاظت کے لیے ان سے بھی مصافحہ کیا۔
علامہ عبدالستار مہاجر مکی اپنے شیخ محمد سعید حسرت عظیم آبادی کے تعلق سے لکھتے ہیں:
شیخ محمد سعید بن واعظ علی بن عمر دراز ایک ممتاز بزرگ، بافیض، بلند سند کے حامل محدث اور اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم

تھے۔آپ معروف عالم شیخ فقیر اللہ جعفری کے صاحبزادے تھے۔نسب کے اعتبار سے والد کی طرف سے طیاری تھے یعنی حضرت جعفر طیار بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت رکھتے تھے اور والدہ کی طرف سے عباسی تھے یعنی حضرت سیدنا عباس بن عبد المطلب کی طرف نسبت رکھتے تھے۔آپ کا تعلق عظیم آباد (پٹنہ) سے تھا اور فقہی طور پر حنفی تھے۔

آپ کی پیدائش ۲۷ ذی القعدہ ۱۲۳۲ھ بروز ہفتہ عظیم آباد میں ہوئی اور وہیں آپ نے نشو نما پائی۔ابتدائی تعلیم اپنے والد اور شہر کے دیگر علما سے حاصل کی اور فارسی خوش خطی بھی اپنے والد ہی سے سیکھی۔اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ کانپور تشریف لے گئے، جہاں شیخ سلامت اللہ صدیقی بدایونی کانپوری سے معقولات اور بعض منقولات کی کتابیں پڑھیں۔انھوں نے آپ کو باقاعدہ اور مفصل اجازت بھی عطا کی۔اس طرح آپ کا علمی سلسلہ بڑے اکابر علماء تک جا پہنچتا ہے۔

1263ھ میں آپ نے حج وعمرہ کی نیت
سے مقامات مقدسہ حرمین شریفین کا سفر کیا۔مکہ
مکرمہ میں آپ کو تمام تر ان احادیث کی اجازت شیخ محمد بن علی سنوسی قیسی خطابی حسنی ادریسی نزیل مکہ مکرمہ سے حاصل ہوئیں جو مسلسل بالاولیۃ ہیں۔

ان سے آپ نے اوائل سنبل پڑھی اور اجازت حاصل کی۔نیز انھوں نے شیخ عبد الرحمن محض اور شیخ عبد الرحمن کزبری کے واسطے سے شیخ سعید واعظ کو تمام معقولات ومنقولات کی اجازت عطا کی۔

آپ نے حدیث کی اہم روایات بھی مستند اساتذہ سے حاصل کیں، خصوصاً "اربعین مسلسل بالأشراف" جیسی احادیث شیخ عبد العزیز دہلوی کے واسطے سے روایت کیں، جن کا سلسلہ شاہ ولی اللہ دہلوی تک پہنچتا ہے۔

سن ۱۲۶۳ھ میں آپ حج کے لیے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔مکہ میں سید محمد بن علی سنوی سے حدیث کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، ان سے بھی آپ کو حدیث کی اجازت حاصل ہے، حدیث کی اجازت کے ساتھ انھوں نے آپ کو روحانی فیوض سے بھی بھرپور انداز میں مستفید کیا، انھیں ذکر کی تلقین کی اور تحفہ کے طور پر متعدد کتابیں بھی عطا کیں۔اس طرح شیخ یعقوب دہلوی مکی سے بھی آپ کو اجازت حدیث بھی حاصل ہے اور شیخ یعقوب مکی نے طریقت کے متعدد سلاسل میں آپ کو اجازت سے بھی نوازا۔

مدینہ منورہ میں آپ نے مؤطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ شیخ محمد بن احمد عطوشی سے پڑھی اور شیخ سے آپ نے اس مبارک ومسعود کتاب کی اجازت حاصل کی، نیز دیگر جلیل القدر علما جیسے شیخ عبد الغنی دمیاطی سے بھی آپ نے استفادہ کیا۔روضہ نبوی کے قریب تر آپ نے دلائل الخیرات سید محمد بن عبد الرحمن مغربی فلانی مکمل پڑھی اور اس کی بھی سند حاصل کی۔

بعد ازاں آپ نے مختلف بزرگوں سے ملاقاتیں کیں، ان سے اذکار ووظائف سیکھے اور علمی وروحانی اجازتیں حاصل کیں، جس سے آپ کی علمی اور روحانی شان مزید بلند ہوئی۔

ان بزرگوں میں ایک نمایاں نام شیخ علامہ مسند عبد الرحمن مظہر نابلسی مدنی قاضی بصرہ و کربلا کا ہے۔ان سے آپ کی ایک ملاقات عظیم آباد میں بھی ہوئی۔انھوں نے آپ کو ذکر اللہ کی تلقین کی، روحانی سلاسل میں آپ کو اجازت دی اور کتب احادیث کی بھی اجازت عطا کی۔

آپ نے پوری زندگی علم کی خدمت، تدریس اور فیض رسانی میں گزاری۔بے شمار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا۔آپ کی تصانیف میں آپ کا شعری دیوان "قسطاس البلاغة" خاص طور پر معروف ہے،اس کے علاوہ بھی کئی علمی کام آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کا انتقال ۴ رشعبان ۱۳۰۴ھ کو ہوا۔(اردو خلاصہ از عربی۔فیض الملك الوهاب المتعالي ملخصا ۱ ۶۸۶)

ایک علمی و روحانی شخصیت کا جامع نقش

> "شیخ محمد سعید حسرت عظیم آبادی کی اسنادی زندگی کا ایک سرا ہندستان کے جلیل القدر محدثین سے ملتا ہے اور دوسرا حجاز کے عظیم محدثین سے۔"

شیخ محمد سعید عظیم آبادی کی زندگی کو سامنے رکھا جائے تو ان کی شخصیت کے کئی پہلو ایک دوسرے میں پیوست دکھائی دیتے ہیں۔وہ عظیم آباد کے فرزند تھے،مگر ان کا علمی سفر انھیں کانپور، دہلی، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تک لے گیا۔وہ حنفی فقیہ تھے،مگر ان کا علمی افق صرف فقہ تک محدود نہ تھا۔بلکہ فقیہ ہونے کے ساتھ وہ محدث و مسند تھے، حدیث ان کے نزدیک محض روایت نہ تھی بلکہ ایک امانت تھی۔وہ صاحب طریقت تھے،لیکن اعلی درجہ کے متبع سنت تھے۔طریقت ان کے ہاں شریعت وعلم سے الگ کوئی مستقل راستہ نہ تھی۔

ان کی اسنادی زندگی کا ایک سرا ہندستان کے جلیل القدر محدثین سے ملتا ہے اور دوسرا حجاز کے عظیم محدثین سے۔شیخ سلامت اللہ کانپوری سے حاصل کردہ اربعین مسلسل بالاشراف کی سند میں شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے امام حدیث کی نسبت آتی ہے، جبکہ سید محمد بن علی سنوسی کی اجازت انھیں مکہ مکرمہ کی علمی و روحانی روایت سے جوڑتی ہے۔

یہ دونوں نسبتیں مل کر شیخ محمد سعید کی شخصیت کا وہ علمی نقشہ سامنے لاتی ہیں جس میں ہند کی علمی روایت اور حجاز کی حدیثی روایت باہم پیوست نظر آتی ہیں۔

اسی طرح ہندستان میں انھوں نے قادری مجددی سلسلہ کی نسبت شیخ شاہ نذر محمد کانپوری سے حاصل کی اور حرم شریف میں طریقت کی اجازت وخلافت شیخ سنوسی سے حاصل کی۔اس طرح آپ مجمع البحرین بن گئے۔

شیخ محمد سعید عظیم آبادی کی حیات دراصل ایک ایسے دور کی علمی داستان ہے جب علم ابھی محض مطبوعہ کتابوں کا نام نہیں تھا۔سند زندہ تھی،استاد زندہ تھا،سماع زندہ تھا،اجازت زندہ تھی اور علم کے ساتھ صحبت وتربیت کا ایک مکمل نظام زندہ تھا۔

انھوں نے علم کو اپنے اساتذہ سے حاصل کیا، اسناد کو سینے میں محفوظ کیا، حرمین کے اکابر سے نسبت قائم کی، طریقت کی راہ میں مشائخ سے فیض پایا، پھر اسی علمی و روحانی امانت کو اپنے تلامذہ تک منتقل کیا۔

شیخ محمد سعید عظیم آبادی اسی مقدس زنجیر کی ایک معتبر اور روشن کڑی تھے۔ آپ عظیم آباد کے افق پر طلوع ہونے والے وہ ستارہ تھے، جن کی تابانی عجم سے عرب تک پہنچی۔ آپ کی شخصیت میں علم کی جلالت، حدیث کی امانت، سند کی پاس داری، طریقت کی نسبت اور عمل و تقویٰ کی روح یکجا ہوگئی تھی۔

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ان کے علمی و روحانی فیوض کو باقی رکھے اور ان کے ذریعے ہم تک پہنچنے والی اس علمی امانت کو آئندہ نسلوں کے لیے بھی نافع اور بابرکت بنائے۔ آمین۔

. . .

متفرقات



دوزی کی تکملۃ المعاجم العربیۃ

مولانا عبدالمتین منیری (نائب صدر جامعہ اسلامیہ بھٹکل)

ہمارے دینی نظام تعلیم میں ایک ماحول بن گیا ہے کہ جن سے ہمارا اختلاف ہوتا ہے یا جنھیں ہم ناپسند کرتے ہیں، اپنے وابستگان کے دلوں میں یک طرفہ نفرت بٹھادیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو چیزیں ہمیں اپنے مخالفین سے سیکھنی ہوتی ہیں اور جو سبق ان سے ہمیں لینا ہوتا ہے وہ ہم نہیں لے پاتے۔

اللہ تعالی کا ایک نظام ہے، جو محنت کرتا ہے اللہ تعالی اس کی محنت کا صلہ اسے ضرور دیتا ہے، یہ جو مسلم مخالف قوتیں دنیا بھر میں عروج پارہی ہیں، اور ترقی کررہی ہیں، اس کا راز ان کی انتھک جدوجہد اور کوششوں اور طریقہ کار میں پنہاں ہے۔

> "شاید آپ کو تعجب ہو کہ اس لغت کا یہ موضوع نہیں ہے اور یہ مصنف کے لیے ممکن بھی نہیں تھا کیوں کہ مصنف کو لسان العرب اور تاج العروس جیسی عظیم کتب لغت مطبوعہ شکل میں دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔"

ہمارے یہاں مستشرقین کے بارے میں عموماً دلوں میں نفرت بٹھائی جاتی ہے، یہ نفرت بٹھانے والے عموماً وہ ہوتے جن کا میدان تحقیق و تصنیف مستشرقین کے میدان سے عموماً مختلف ہوتا ہے، مستشرقین کی ایک بڑی تعداد نے اپنا مشن لغت نویسی، مخطوطات کی حفاظت اور ان کی تحقیق واشاعت کو بھی بنایا تھا، ان میدانوں میں ان کی انتھک کوششوں اور قربانیوں سے ہمارے طلبہ وفارغین ناواقف ہیں۔

یہ درست ہے کہ زوال اندلس کے بعد مغربی سامراج کے دور عروج سے مغرب کو استشراق کے میدان میں کام کی ضرورت پیش آئی، اور انھوں نے اپنی سلطنتوں کو مستحکم کرنے اور غلام اقوام کی تہذیب وثقافت اور ان کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے استشراق کے شعبے کو اپنی وزارت خارجہ کے ماتحت قائم کیا اور اس پر بے دریغ پیسہ بہایا اور یہ کہ ابتدا میں اس میدان میں کام کرنے والوں پر متعصب عیسائی مشنریز کا غلبہ رہا لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اور عربی کتابوں اور مخطوطات میں رچ بس جانے کے بعد ان میں سے بہتوں کو عربی زبان وتہذیب سے جو مسلمانوں کی تہذیب تھی، بے پناہ محبت بھی پیدا ہوئی اور ان میں عربی زبان سے محبت رکھنے والے، اس کی باریکیوں کے ایسے شناور پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کے لیے صرف کیں۔ ان میں بہت سے فراموش شدہ قلمی کتابوں کی تحقیق کرکے انھیں نئی زندگیاں دینے والے بے شمار محققین پیدا ہوئے، جب کہ مشرق میں فن طباعت انگلیوں کے

بل چل رہا تھا۔

ان میں سے بعضوں کی عربی زبان وادب وتاریخ کے میدان میں محنت اور قربانی کو جان کر ہمارے اسلاف کی قربانیوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور حسرت بھی ہوتی ہیں، کہ اگر اللہ تعالی نے انہیں ایمان کی دولت سے نوازا ہوتا تو یہ علمی میدانوں میں کیا کچھ دین اسلام کی خدمت نہ کرگزرتے۔ اسلامی معاشرے میں نہ رچنے بسنے اور علمائے دین سے علم دین اور عربی زبان پر مہارت حاصل نہ کرنے کی وجہ سے ان میں سے بہتوں نے اسلام وعربی لٹریچر کو سمجھنے میں بڑی ٹھوکریں لگیں اور انھوں نے اپنے مغربی ماحول اور معاشرت کے اثر میں غیر ارادی طور پر اسلام سے وابستہ امور کو درست طور پر سمجھنے میں جگہ جگہ غلطیاں کیں۔ لہذا ہم ان میں سے بہتوں کی غلط بیانی کو ہمیشہ نیت کے فتور پر محمول نہیں کرسکتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بہت سارے مستشرقین جن کی عبارتیں ہم اسلام اور حضور اکرم ﷺ کی تعریف میں نقل کرتے ہیں، انھی مستشرقین کی کتابوں میں دوسری جگہ اسلام اور حضور اکرم ﷺ کے سلسلے میں ایسی ایسی ہفوات دیکھتے ہیں کہ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔

آئیے! آج یہاں ہم مستشرقین کے اہم علمی کاموں میں ایک کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جس کے لیے ہم نے مستشرق ڈوزی کی موسوعی لغت تکملۃ المعاجم العربیۃ کو منتخب کیا ہے۔ جس کی فرمائش ہمیں چند روز قبل بزم علم وکتاب کے رکن رکین مولانا محمد عزیر فلاحی صاحب سے موصول ہوئی ہے۔



کتاب کا نام: تکملة المعاجم العربية

مصنف: رينهاٹ دوزی

مترجم: الدكتور محمد سليم النعيمي و جمال الخياط

ناشر: دار الرشيد للنشر، وزارة الثقافة و الاعلام

ایڈیشن: 1908

جلدیں: 10

عربی زبان کی یہ لغت فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی، اور اس کا اصل نام ہے

DICTIONNAIRES ARABES AUX SUPPLÉMENT

یہ کتاب آج سے ڈیڑھ سو سال قبل 1880ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی، اس کی پہلی جلد بڑے سائز کے (907) صفحات اور دوسری جلد (828) صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کے نام سے اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب عربی زبان کی جملہ معاجم کو دیکھ کر تیار کی گئی ہے۔ اور اس میں وہ الفاظ بیان ہوئے ہیں جو دوسری عربی زبان کی معاجم میں پائے نہیں جاتے۔

شاید آپ کو تعجب ہو کہ اس لغت کا یہ موضوع نہیں ہے اور یہ مصنف کے لیے ممکن بھی نہیں تھا کیوں کہ مصنف کو لسان العرب اور تاج العروس جیسی عظیم کتب لغت مطبوعہ شکل میں دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

فاضل مترجم سلیم النعیمی نے کتاب کے عربی نام کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اس کے فرانسیسی نام کے عربی میں مختلف ترجمے ہوتے ہیں، جن میں: الملحق بالمعاجم العربية، ملحق بالمعاجم العربية، ملحق المعاجم العربية، ذيل المعاجم العربية، ملحق وتكملة القواميس العربية، اور تكملة المعاجم العربية وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ہم نے اس آخری نام کی شہرت اور مکتبہ لبنان کے ایڈیشن میں یہ نام ہونے کی وجہ سے اسے اختیار کرنا مناسب سمجھا ہے۔

آئیے! ان چند تمہیدی باتوں کے بعد مصنف کے حالات زندگی اور کتاب کے تعارف کی طرف جاتے ہیں۔

حالات زندگی

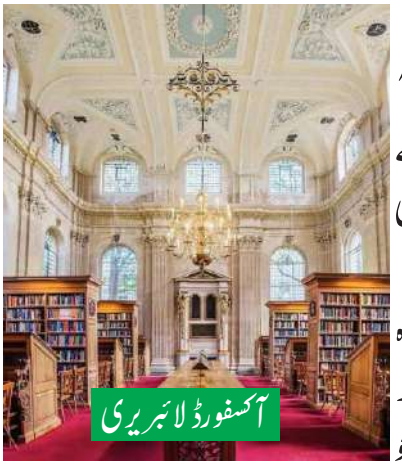
مصنف کا نام رینہارٹ پیٹر آن دوزی (Reinhart Pieter Anne Dozy) ہے، جو ایک ڈچ مستشرق (مشرقیات کے ماہر) تھا۔ وہ ایک فرانسیسی النسل پروٹسٹنٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے آباو اجداد کا فرانسیسی نام "آل ووزی" (ozy) تھا، جو سترھویں صدی کے وسط میں مذہبی جبر سے بچنے کے لیے فرانس سے ہالینڈ منتقل ہو گئے تھے۔ فرانس کی اضافی علامت "d" کو ہالینڈ میں رہائش کے بعد نام میں شامل کر کے "Dozy" بنا دیا گیا۔ اس کا خاندان مشرقی علوم سے محبت رکھنے والا تھا اور اس کا رشتہ آل شولتنز خاندان سے تھا، جس نے کئی علما پیدا کیے۔

رینہارٹ دوزی 1820ء (1235ھ) میں لائیڈن (ہالینڈ کا ایک شہر) میں پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی عربی گھر پر سیکھی، پھر یونیورسٹی آف لائیڈن میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اس کے استاد "فاریس" نے اسے عربی زبان کی گہرائی میں جانے اور اس کے نادر الفاظ سیکھنے کی طرف راغب کیا، تاکہ وہ جاہلی دور کی شاعری کو بہتر طور پر سمجھ سکے۔ چنانچہ اس نے عربی ادب و تاریخ کی کئی کتب کا مطالعہ کیا اور طلب علم کے زمانے اور بعد میں بھی ذہانت، سنجیدگی اور محنت کے لیے مشہور رہا۔



یونیورسٹی آف لائیڈن نے عربوں کے ملبوسات پر ایک مقالہ لکھنے کے لیے مستشرقین سے درخواست کی اور اس کے لیے انعام مقرر کیا۔ دوزی نے بطور طالب علم (جب اس کی عمر بائیس سال سے زیادہ نہ تھی) اس میں حصہ لیا اور انعام حاصل کیا۔ اس کام یابی نے اسے آسیائی مجلہ (Asian Journal) میں لکھنے پر آمادہ کیا، چنانچہ اس نے عربی مصادر سے "بنو زیان ملوکِ تلمسان" کی تاریخ ترجمہ و تشریح کے ساتھ شائع کی۔

دوزی نے 1845ء میں ایک ڈچ خاتون سے شادی کی، اور جرمنی میں ہنی مون کے لیے گیا۔ مگر اس نے یہ وقت جرمن کتب خانوں میں گزارا۔ وہاں اسے ابن بسام کی "الذخیرۃ" کی تیسری جلد ملی، جو فہرست میں المقرّی کی طرف منسوب تھی۔ وہ اجازت لے کر اسے لائیڈن لے آیا۔ جرمنی میں اس کی ملاقات معروف مستشرق ومشرقی علوم کے پروفیسر" ہنریخ فلیشر" (1801-1888) سے ہوئی، جو بعد میں اس کا قریبی دوست رہا۔


آکسفورڈ لائبریری

دوزی 1845 میں انگلینڈ چلا گیا، جہاں اس نے آکسفورڈ لائبریری سے" الذخیرہ" کا دوسرا حصہ اور کئی قیمتی عربی مخطوطات نقل کیے۔ وہاں اس نے کئی مستشرقین سے ملاقاتیں کیں۔ ہالینڈ واپس آنے پر اسے لائیڈن کی اورینٹل لائبریری کے مخطوطات کی انتظامی ذمہ داری سونپی گئی، جہاں اس نے دو فہرستیں تیار کیں۔

1850 میں اسے لائیڈن یونیورسٹی میں عربی زبان کا پروفیسر مقرر کیا گیا اور یہ عہدہ اس نے 1878 تک سنبھالا، جس کے دوران اس نے یونیورسٹی کی بڑی تشہیر کی۔ 1878 کی انقلاب کے بعد اسے عمومی تاریخ پڑھانے کا کام سونپا گیا، جس پر مستشرقین کو افسوس ہوا۔ دوزی سامی زبانوں کا ماہر تھا، یونانی جانتا تھا، اور لاطینی، ڈچ، فرانسیسی، جرمن زبانوں میں لکھتا تھا، نیز پرتگالی اور ہسپانوی سے واقف تھا۔ وہ عربی میں" رنجرت دوزی" کے نام سے دستخط کرتا تھا۔ وہ 1883 (1300 ہجری) میں فوت ہوا۔ دوزی کو وسیع شہرت ملی اور اسے متعدد اعزازات سے نوازا گیا، جیسے ایمسٹرڈم کی رائل اکیڈمی آف سائنسز، کوپن ہیگن اکیڈمی، اور پیرس کی ایشیائی سوسائٹی کا رکن بنایا گیا۔ مستشرقین کے نزدیک وہ اندلس کے مطالعات کا بانی تھا، اور اس کی تصانیف اندلس کی تاریخ، تہذیب، اور ثقافت کے لیے مرجع سمجھی جاتی ہیں، اگرچہ بعد کے محققین نے اس کی تحقیقات میں کچھ کمیاں نکالیں۔

دوزی کو یہ معجم لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس کا منہج کیا ہے اس پر مصنف نے اپنے مقدمہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کالم ان تفصیلات کا متحمل نہیں ہوسکتا، جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس معجم کو جمع کرنے میں اس نے بے انتہاء محنت کی ہے، اس میں اس نے اندلس کے دور سے شمالی افریقہ کے عرب ممالک میں رائج زبان کے ان الفاظ کو اپنی لغت میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے، جنھیں مصنف کے زمانے تک کے عرب مصنفین اور مغربی لغت نویسوں نے درخور اعتنا نہیں سمجھا، اس سے خاص طور پر اندلسی ادب سمجھنے میں مصنف کی بے پناہ دلچسپی کا احساس ہوتا ہے۔

دوزی نے اپنی لغت میں عربی زبان کو دوسری مغربی زبانوں اور معاشروں کے مطابق دیکھنے کی کوشش کی ہے، جس میں اسے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں، اس کا اندازہ آپ اس کی اس عبارت سے لگا سکتے ہیں۔

"فصیح عربی زبان، جو قدیم شاعری، قرآن اور حدیث کی زبان ہے، صرف تقریباً دو سو سال تک زندہ رہی۔ پہلی صدی ہجری

تبصرہ

کے اختتام پر، اس سے پہلے کہ عربوں کے ہاں نیا ادب پیدا ہو، زبان میں بہت سے تغیرات رونما ہوئے، جو وقت کے ساتھ بڑھتے گئے۔ یہ تبدیلی تیز رفتار فتوحات کا نتیجہ تھی، وہ فتوحات جو معجزوں جیسی تھیں، جنھیں رسول کے پیروکار مسلمانوں نے سر کیا۔ عربی زبان صرف عربوں تک محدود نہ رہی بلکہ مفتوحہ علاقوں کی زبان بن گئی۔ شکست خوردہ اقوام، جو عربی بولنے لگیں اور اس میں غلطیاں کرنے لگیں، ان کا اثر خود عربوں پر بھی پڑا۔ عربوں نے عربی زبان کے اِعراب کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا، اور الفاظ کو ان کے اصل معانی سے ہٹا کر استعمال کیا، نیز اہلِ شام، ایرانیوں، قبطیوں، بربروں، ہسپانویوں اور ترکوں سے کئی الفاظ اور تعبیرات مستعار لیں"۔۔۔۔

لیکن یہ تبدیلی سخت مزاحمت کے بغیر نہ ہوئی۔ ان لوگوں کی طرف سے جنھیں زبان کی صحت اور پاکیزگی سے گہری دلچسپی تھی، یعنی نحویوں، لغویوں، متکلمین اور فقہاء کی طرف سے۔ یہ لوگ فصیح عربی کے علاوہ کسی اور زبان کو پڑھنے کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے حقیقتِ حال کا انکار کیا، اور نہ خود سمجھنا چاہا اور نہ ہی دوسروں کو سمجھنے دیا کہ دنیا کی ہر چیز تبدیلی کے تابع ہے، زبانیں بھی ویسے ہی بدلتی ہیں جیسے خیالات بدلتے ہیں، اور زبانیں اس معاشرے کے تابع ہوتی ہیں جو انہیں بولتا ہے، اور ان اہلِ قلم کے اثر میں رہتی ہیں جو انہیں برتتے ہیں۔

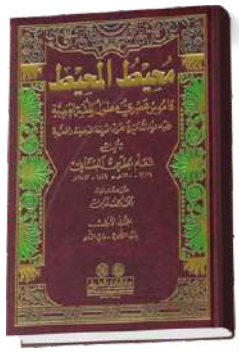
انھوں نے یہ چاہا کہ عربی زبان جیسی ہے ویسی ہی قائم رہے، اور قرآن کی زبان ہمیشہ کے لیے زندہ رہے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس نئے الفاظ کو کمتر دکھانے اور ان کی توہین کے سوا کچھ نہ تھا، جنھیں ان کے ہم عصر گھڑتے تھے۔ زبان کے فساد اور اس کی پاکیزگی کے مٹنے سے بچنے کے لیے، کیونکہ ان کے نزدیک زبان ایک مقدس چیز تھی، انھوں نے زبان کے لیے بے شمار قواعد وضع کیے، لغات مرتب کیں، تند و تیز مضامین لکھے جن میں عام رائج غلطیوں پر سخت تنقید کی، اور ان غلطیوں کو جو عوام ہی نہیں خواص بھی کرتے تھے، طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا، اور یہ رہنمائی دی کہ کیا کہنا درست ہے اور کیا نہیں۔

اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ان کی کوششیں بے سود نہیں گئیں۔ اگرچہ وہ زبان کی تبدیلی کو مکمل طور پر روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے، مگر وہ کسی حد تک اس تبدیلی کو موخر کرنے اور محدود دائرے میں رکھنے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ انہی کی بدولت، اور قرآن کے مطالعے کی بدولت، جو اسلامی ثقافت کی بنیاد تھا، عربوں میں نئی زبانیں جنم نہ لے سکیں جیسا کہ لاطینی زبان سے رومی زبانیں وجود میں آئیں۔ آج بھی عربی تحریر کی زبان قدیم زبان کے بہت قریب ہے، کم از کم قواعد کی پابندی کے لحاظ سے، اگرچہ بول چال کی زبان میں بہت تبدیلی آچکی ہے۔

تاہم وہ فطری عمل کو روک نہ سکے، کیونکہ کئی ادیب بغیر کسی جھجک کے عوامی زبان اختیار کرتے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر، مقدسی جو دسویں صدی عیسوی کے ایک سیاح تھے، کہتے ہیں کہ وہ عمومی طور پر اہل شام کی زبان میں، یعنی اپنے علاقے کی زبان میں، لکھتے ہیں، اور اپنے وطن کی اور ہر علاقے کی توصیف میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو زیادہ قابل فہم ہوں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو زبان کی پاکیزگی اور خلوص کے پابند تھے، وہ بھی غیر شعوری طور پر نئے بنائے گئے الفاظ استعمال

کرتے تھے، بلکہ اکثر وہ اپنی لغات میں فصیح الفاظ کی تشریح بھی انہی نو ایجاد الفاظ سے کرتے تھے۔ اندلس کے بعض مشہور نحوی حضرات تو عوامی زبان کے ذریعے فصیح عربی سکھاتے تھے۔ پس یہ سچ کہا گیا ہے کہ عملی دنیا نظریاتی اصولوں کی ہمیشہ پیروی نہیں کرتی۔

اس نے عربی معاجم میں سے بطرس البستانی کی محیط المحیط سے استفادہ کیا ہے، اس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ ''ایک اور معجم جس کی نوعیت مختلف ہے، میں نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا، وہ ہے بطرس البستانی کا ''محیط المحیط'' جو بیروت میں 1870ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک عمدہ مجموعہ ہے، جس میں قدیم معاجم سے بھی مواد ہے، نیز متعدد مولد الفاظ اور نئے معانی بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس میں شامی عوامی زبان (عامیۃ) سے بھی الفاظ شامل کیے گئے ہیں، جنھیں میں نے اپنے معجم میں شامل کیا۔''



یہاں اس نے جو بات کہی ہے وہ اس کی علمی دیانت اور نیک نیتی اور انکساری کا مظاہرہ کرتی ہے، وہ کہتا ہے: ''مگر جہاں تک اسلامی علوم سے متعلق اصطلاحات کا تعلق ہے جو بستانی نے بڑی تعداد میں درج کی ہیں، میں نے اکثر کو مسترد کیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں:

1. ان اصطلاحات کی تعریفیں اکثر مبہم ہیں، اور بغیر کسی دیگر عربی کتاب کے انہیں سمجھنا مشکل ہوتا ہے؛
2. ان اصطلاحات کو سمجھنے کے لیے متعلقہ علم میں مہارت درکار ہے، جو میرے پاس نہیں۔

میں بالآخر یہ تسلیم کرتا ہوں، جیسا کہ فریتاگ نے بھی کیا، کہ ان علوم کی میری واقفیت بہت کم ہے۔ اور فریتاگ کی طرح میں بھی سمجھتا ہوں کہ انسانی عمر اتنی نہیں کہ کوئی ایک شخص ایک ساتھ زبان عربی اور تمام اسلامی علوم کو بخوبی سمجھ سکے۔ اور چونکہ میرا رجحان تاریخ کی طرف ہے، اس لیے مجھ جیسے شخص سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ میں یہاں اعتراف کرتا ہوں کہ اگر میں صوفیانہ اصطلاحات کی گہرائی میں گیا ہوتا تو شاید میرا ذہنی توازن متاثر ہو جاتا۔ لہٰذا میں یہ کام خوشی سے دوسروں کے لیے چھوڑتا ہوں۔

اس نے کتاب کے منہج کو واضح کرنے کے لیے مزید وضاحت کی ہے کہ ''اور شاید میرا یہ اندیشہ کہ میرا معجم کہیں جدید عربی زبان کا معجم نہ سمجھا جائے، یہی وجہ بنی کہ میں نے معجم بوسیر سے اتنا زیادہ اقتباس نہیں کیا جتنا کرسکتا تھا، چاہے میں بروقت اس سے واقف ہو بھی جاتا۔ پھر بھی، یہ معجم جیسا کہ اب ہے، کسی حد تک جدید عربی کا رنگ رکھتا ہے، حالانکہ میں نے اسے قرونِ وسطیٰ کی زبان کے لیے مرتب کیا تھا۔''

وہ مزید کہتا ہے کہ میں نے بھی کوشش کی کہ میرا معجم بلاوجہ طویل نہ ہو، اس لیے میں نے ان اشیاء کے نام چھوڑ دیے جو امریکہ کی دریافت کے بعد سامنے آئیں، نیز آتشیں اسلحہ، جدید کرنسیوں کے نام، اور وہ ہسپانوی الفاظ جو مراکشی عوامی زبان میں شائع ہو چکے تھے (جن کی طرف سیمونیہ نے دی لاتور اور لیرشنی کی مراسلات کی بنیاد پر اشارہ کیا ہے)۔

وہ مزید کہتا ہے کہ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں ان تمام الفاظ کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا جنھیں میں نے جدید معاجم

سے لیا۔ میں صرف انہی الفاظ کو حرکت دے کر لکھتا ہوں جن کے بارے میں مجھے پوری تحقیق ہو کہ میری حرکات درست ہوں گی۔

یورپی سیاحوں کی ایشیا اور افریقہ کی سیاحت کے دوران مرتب کردہ معلومات سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ میں نے ان کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، جیسا کہ اس مقدمے کے بعد دیے گئے فہرست المؤلفین میں ذکر کیا گیا ہے۔ تاہم ان مصنفین نے اکثر الفاظ کو اپنی مرضی کے مطابق لکھا، جس سے مجھے الجھن ہوئی، اور میں نے ان میں سے بہت سے الفاظ کو نظر انداز کر دیا، البتہ ان کو ایک علاحدہ نوٹ بک میں درج کیا ہے جو لائبریری میں محفوظ ہے تاکہ دوسروں کے کام آسکے۔ کچھ الفاظ غالباً دیگر زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ میری بنیادی مآخذ وہ تصانیف تھیں جو عربوں نے قرون وسطیٰ میں لکھی تھیں اور میں نے انہیں یا تو چھپی ہوئی حالت میں یا یورپی کتب خانوں میں موجود مخطوطات کی شکل میں پڑھا۔ ان کا موضوعات مختلف تھے۔ میں نے درج ذیل مصادر سے لغات جمع کیں، پھر اس نے ان عربی کتابوں کی تفصیل دی ہے جس سے اس نے استفادہ کیا۔

بنیادی طور پر یہ لغت مفردات کی اصل تک پہنچنے کے علم اشتقاق etymology سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں کہتا ہے کہ میں نے ان الفاظ کی اصلیت (etymology) کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں تک میری رسائی تھی، لیکن اس مطالعے پر میں اس گہرائی سے توجہ نہ دے سکا جیسی میں دینا چاہتا تھا۔ میرے اس افسوس کو اس بات سے کچھ تسلی ملتی ہے کہ بہت سے فصیح عربی لغات بھی عجمی الاصل الفاظ کے مصادر کا تعین نہیں کرتیں۔ میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میرا معجم نباتاتی ناموں کے لحاظ سے بہت مفید ہے۔

''میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یہ کام مکمل کرنے کی توفیق دی۔ یہ کام مجھ سے طویل وقت کا متقاضی تھا۔''

''مجھے تمام حوالہ جات اور متون دوبارہ دیکھنے اور ان کی تصحیح کرنی پڑی، جن میں سے بعض چالیس سال پہلے نقل کیے گئے تھے۔ اگر میں پہلے سے جان لیتا کہ کتابت اور ترتیب معجم کا کام آٹھ سال مسلسل محنت کا تقاضا کرے گا تو شاید میں اس میں قدم رکھنے سے ہچکچاتا۔''

. . .

اہم اعلان

قارئین کرام! سہ ماہی کتاب وسنت، دہلی کے چاروں شماروں
کی پرنٹ کاپی حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں۔

9873998015



سلفی کتب سنت

کے آن لائن مطالعے کے لیے اسکین کیجیے:



یا دیکھیے:

Website. www.kitabosunnat.in